اُترن
واجدہ تبسم

واجدہ تبسّم

اورسیز بک سینٹر

۵۴ - جہو ولے پارلے اسکیم نارتھ لنکن روڈ

بمبئی ۵۸

سلسلہ مطبوعات نمبر ۳

طبع اوّل جنوری ۱۹۷۷ء

تعداد اشاعت ۲۰۰۰

قیمت : ۲۰ روپے

اپنے عزیز ترین دلیور

نازی کے نام

جو ۲۹ سال کی عمر میں ۲۴ مئی ۱۹۷۴ء کو جینے کی
خواہش لئے ایک ٹرک کے حادثہ کا شکار ہو گیا

ناشر : اشفاق احمد
اورینٹ بک سنٹر بمبئے ۵۸

طابع : سراج الدولہ

کتابت : شمس

مطبع : یونیورسل لیتھو پبلیسی ۲۳ نور وجی اسٹریٹ بمبئی ۲

بائنڈنگ : محمد ابرار

فہرست

قوسِ خیال

"اترن"۔ میری، حیدرآبادی ماحول پر لکھی گئی کہانیوں کا مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

کسی بھی لکھنے والے کو اس حد تک تو برداشت کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے پہلے مجموعے میں اپنے ذاتی حالات اور خیالات بیان کر دے، لیکن ہر کتاب میں کہانیوں سے پہلے ایک لمبا چوڑا مضمون، دوا کی شیشی کی یاد دلاتا ہے جس میں ایک پرچہ ترکیب استعمال کے طور پر ملفوف ہوتا ہے ۔ میں پیش لفظ لکھنے سے بہت کتراتی ہوں، میں نے صرف اپنی پہلی کتاب "شہر ممنوع" میں ایک بہت طویل مضمون، اپنے حالاتِ زندگی سے متعلق لکھا تھا اور یوں ہی نہیں لکھ دیا تھا وہ میری پہلی کتاب تھی اور لوگ میرے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ اور مجھے پڑھنے والوں کی خواہش کا احترام کرنا لازم تھا۔ اس کے بعد میری سات آٹھ کتابیں چھپیں۔ لیکن میں نے کچھ نہیں لکھا ۔ لیکن اس بار بات کچھ اور ہے۔ یہ کہانیاں ۔۔ حیدرآبادی ماحول پر لکھی ہوئی میری کہانیاں بیک وقت میری رسوائی

کا باعث بھی بنی ہیں اور میری قدردانی کا بھی —

قدردانی کا جہاں تک سوال ہے۔ اسے فی الوقت جانے دیجئے کیونکہ اپنے منہ اپنی تعریف صرف مٹھو کرتے ہیں۔ اور میں اپنا شمار انسانوں میں کرتی ہوں، جو صرف حقیقت کا اظہار کرنا پسند کرتے ہیں۔ رسوائی کا بھی مجھے کوئی ایسا ڈر نہیں لیکن الزامات کی فہرست جب ضرورت سے زیادہ لمبی ہو جائے تو قلم اٹھانا ضروری ہو جاتا ہے—

"واجدہ نے حیدرآباد کی تہذیب کا مذاق اڑایا ہے —"

"واجدہ نے حیدرآبادی اور دکنی بولی کا غلط استعمال کیا ہے چٹخاروں کی خاطر زیادہ — وہاں کی تہذیب اور کلچر کو اجاگر کرنے کی خاطر کم — بہت کم"

"واجدہ نے نوابوں کے کردار دل سے تراشے ہیں —"

"واجدہ کے یہ افسانے شریف بہو بیٹیوں کے پڑھنے کے لائق نہیں ہیں —"

"واجدہ نے حیدرآباد کی پاکیزہ تہذیب کو آرٹ بنا کر فحش نگاری کی انتہا کر دی ہے۔"

واجدہ کو حیدرآباد دکن کے بارے میں خاک بھی معلومات نہیں — پتہ نہیں کہاں کہاں کے خیالی پیکر تراشے ہیں —"

یہ اور ایسے ہی کتنے الزام —

اب ذرا میری بھی کچھ سنیئے —— ہندستان اور پاکستان دو ٹکڑوں میں بٹے — لیکن میں کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی — میرے دل

اور ذہن کے کچھ ٹکڑے تو میرے وطن امراوتی میں رہ گئے کچھ حیدرآباد
دکن کو ہجرت کر گئے ۔ میں نے حیدرآباد دکن میں چودہ برس کا بن
باس جھیلا ــــ یہ بن باس جنگلوں میں ملا ہوتا تو شائد سیتا پھل
اور رام پھل کھا کر زندگی گزار دیتی ! لیکن یہ بن باس مجھے حیدرآباد
دکن میں ودلیعت کیا گیا تھا ۔ جہاں میں نے "زہر پھیل" کھا کھا کے بھی
خود کو زندہ پایا ــــ بارہ برس کی گڑیاں کھیلنے اور بے فکری سے غل غپاڑے
مچانے کی عمر میں اچانک ہاتھوں میں ایسا جام جمشید تھما دیا جائے جس میں صرف
سسکتے روتے آہیں بھرتے چہرے ہی نظر آتے ہوں تو دنیا پھر اتنی خوبصورت
نظر نہیں آتی ــــ ویسے تو زندگی نے پہلے بھی مجھ سے کوئی خوبصورت
سلوک نہیں کیا تھا ، ایک برس کی عمر میں ماں اور تین برس کی عمر میں باپ
بھی ساتھ چھوڑ جائیں تو ایسی زندگی ، زندگی کی تہمت سے زیادہ معنی
نہیں رکھتی ۔ لیکن حیدرآباد دکن پہنچ کر جب میں نے انسانوں ہی کا
انسانوں سے ایسا ناروا اور نامنصفانہ سلوک دیکھا تو میں اپنی جگہ سہم
کر رہ گئی ۔ لیکن جیسا کہ قانون قدرت ہے کہ کوئی بھی بیج زمین میں ڈالا
جائے تو وہ کبھی پھل نہیں دینے لگتا ، میرے ذہن کی زمین میں بھی ان
بیجوں کی بوائی ہوئی اور وقت آنے پر ان میں کونپلیں بھی پھوٹیں ، پھول
پتے بھی آنے لگے اور اب پھل بھی آنے شروع ہوئے ۔ یوں سمجھیئے کہ یہ فصل
کہیں ۲۸ سالوں میں جاکر بہار پر آئی ہے ــــ جو لوگ مجھ پر یہ الزام لگاتے
ہیں کہ میں نے حیدرآبادی نوابوں پر الزام لگائے ہیں ۔ دل سے خیالی
پیکر تراشے ہیں ، انھیں بدنام کیا ہے ، جا بے جا تہمتیں لگائی ہیں ــــ

اُن میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے حیدرآباد دکن میں ایک سال بھی گزارا ہے۔ یا اگر ساری زندگی بھی گزاری ہے تو کیا آنکھیں کہیں رہن رکھ دی تھیں ۔ ؟ میرے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ میں اپنی آنکھوں کے ساتھ جیتی ہوں ۔

قدرت کا ایک بڑا اٹل قانون یہ بھی ہے کہ ظلم کا پیمانہ جب بھر جاتا ہے تو اس کا ان دیکھا ہاتھ اس پیمانے کو اوندھا دیتا ہے ۔ حیدرآباد دکن کی شاندار تاریخ کا دردناک المیہ میں نے ہی نہیں سبھوں نے دیکھا ہے ۔ لوگ اسے سیاسی روپ دیتے ہیں دیتے رہیں ۔ میں اپنی زبان میں اسے آہوں کی لپیٹ کہتی ہوں ، جس نے تاریخ کا نقشہ بدل دیا ۔ لوگ مجھ سے یہ بھی کہتے ہیں کہ گڑے مُردے کیوں اکھاڑتی ہو ۔ اور اس کا فائدہ کیا ہے ؟

گڑے مردے اکھاڑنے کا جہاں تک سوال ہے تو میں نہ لکھتی، کبھی کوئی اور لکھ دیتا ۔ ! بہرحال زمین میں دفن خزانے تو نمودار ہوتے ہی ہیں ۔ کبھی زرِ گل کی صورت ، کبھی قلمی شہ پاروں کی صورت ۔ نام بدل جانے سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ آج واجدہ تبسم نہ لکھتی کل کوئی اور لکھ دیتا ۔ لیکن آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ ساری کہانیاں یوں ہی سوئی رہتیں ؟ کیا چمکی، زینب ، صندل ، صنوبر ، آبرو ، زیتون ، اور گل چمن کی آہیں یوں ہی اوپر ہی اوپر خالی چلی جاتیں ۔ ؟

رہی فائدے کی بات تو وہ یہ ہے کہ نئی نسل کو پتہ تو چلے کہ ان کے بزرگوں کی کن زیادتیوں کی سزا وہ جھیل رہے ہیں ۔ لوگوں کو میری

ان کہانیوں میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، مجھے کوئی نقصان نظر نہیں آتا ۔ یہ میرا یقین ہے کہ دنیا میں ہر جرم، ہر گناہ روزِ اول سے ہوتا آیا ہے، ہوتا بھی رہے گا ۔ لیکن پھر بھی ان کہانیوں کو پڑھ کر ظلم سہنے والوں کے دل میں اگر بغاوت کی ایک ہلکی سی لہر بھی جھکولا لیتی ہے تو یہ میری معراج ہے ۔ حضرت عمر فاروق کا قول ہے ۔ " ظلم کرنے والے سے زیادہ ظلم سہنے والا قصوروار ہوتا ہے ۔" میں نے یہ کہانیاں لکھ کر ظلم سہنے کے خلاف ایک جہاد کیا ہے ۔

فحش نگاری کا الزام ہی مجھ پر سرے سے غلط ہے ۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سلیقے اور پردہ داری کے ساتھ قلم سے ادا کر دیا ہے ۔ مجھے نہیں معلوم فحش نگاری کسے کہتے ہیں ۔ ایک کہانی "نولکھا ہار" سخت موردِ عتاب بنی ۔ ایسی تو میری کئی کہانیاں تھیں ۔ جن کی وجہ سے وہ پرچے جلا دیئے گئے جن میں وہ چھپی تھیں ۔ احتجاجی جلوس نکالے گئے ۔ دفاتر کو آگ لگا دینے کی کوشش کی گئی ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مجھے قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں، لیکن 'نولکھا ہار' کی بعض پہیلیوں پر سخت غصہ اور غضب کا اظہار کرتے ہوئے مقدمہ تک دائر کرنے کی کارروائی کی گئی ۔ حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ، جن کا آج ہندستان سال مناتا ہے، جن کا مقدس اور مبارک نام زبان پر آتے ہی دل، عقیدت سے بھر جاتا ہے ۔ انہی کی پہیلیاں اگر میں اپنی کہانی میں پیش کر دوں تو اس میں اس قدر داویلا کیوں ۔ ؟؟ اور جہاں تک مجھ پر حیدرآبادی اور دکنی زبان کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے، مذاق اڑانے

کا الزام ہے اس سے زیادہ بے تکی بات میں نے آج تک نہیں سُنی ۔

میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ خودستائی کے جملہ حقوق میں نے طوطوں کے نام منتقل کر دیئے ہیں ۔ میں تو صرف اس حقیقت کا اظہار کروں گی کہ ۱۹۶۷ء سے لے کر آج دسمبر ۱۹۷۶ء تک کوئی بھی میرے سامنے اگر یہ دعویٰ کرے کہ ہاں واجدہ تبسّم نے اس جگہ دکنی بولی کا غلط استعمال کیا ہے ۔ یا اس جگہ حیدرآبادی زبان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے تو میں اپنا قلم توڑ کر لکھنے سے توبہ کر لوں گی ۔ لیکن مجھے امید کیا یقین ہے کہ میرے سامنے کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ میں نے اس میٹھی اور رسیلی حیدرآبادی زبان کے ایسے ایسے پہلوؤں کو ڈھونڈ نکالا ہے جہاں شاید ہی بڑے سے بڑے ماہرِ اہلِ زبان کی بھی نظر گئی ہو حیدرآبادی زبان وہ واحد زبان ہے ۔ جیسں مخاطبت کی حد تک تذکیر تانیث کی کوئی بھی تخصیص نہیں ۔ کسی بھی حویلی ، محل ، میں آپ چلے جایئے ۔ مخاطب نواب صاحب ہوں یا بیگم پاشا ۔ انداز تخاطب دونوں ہی کے لئے یہ ہو گا ۔

" آپ اتّے صبو صبو کاں جا رئے ۔ "

ویسے عام اردو زبان میں نواب صاحب کے لئے یوں ہوتا

" آپ اتنی صبح صبح کہاں تشریف لے جا رہے ہیں ۔ "

اور بیگم پاشا کے لئے ۔ " آپ اتنی صبح صبح کہاں تشریف لے جا رہی ہیں ۔ "

انداز گفتگو کی ایک حیرت انگیز یکسانیت ملاحظہ کیجئے۔
شادی کی محفل ہے۔ نواب پاشا کنیزوں اور خواصوں پر چلّا رہی ہیں
"اُجاڑ مٹی پڑ کو جاؤ، دولہن کب سے نہا کو بیٹھی، کوئی مہندی بھی بھجگائے کی نیئں ۔"
اب ایک منظر دیکھئے جہاں میّت پڑی ہوئی ہے۔ وہی انداز۔
" اُجاڑ مِٹی پڑ کو جاؤ، غسالن آئی کی نیئں۔ ہور وہ عطر پھولاں منگائے کی نیئں ۔"
شادی کی، خوشی کی محفل ہو یا موت کی، غمی کی ۔ بات شروع ہوگی اُجاڑ مٹّی پڑ کو جاؤ سے ۔"
اردو کی صحیح زبان ۔ جو عام طور سے ہندستان بھر میں رائج ہے اور بولی جاتی ہے ۔، جہاں ایک مرد چائے پینے کے لئے وہی کہے گا ۔ جو عورت کہے گی ۔ یعنی ۔
" میں نے چائے پی لی ۔"
اب سنئے حیدرآبادی زبان میں اسی ایک بات کو کتنے طریقوں سے کہا جا سکتا ہے ۔
(مرد کی زبان سے)
۱ ۔ میں چائے پی لیا
۲ ۔ میں نے چائے پی لیا
۳ ۔ میں چائے پیا
۴ ۔ ہم چائے پی لئے ۔

۵ - ہمیں چائے پی کو بیٹھا -

اور عورت یوں کہے گی -

۱ - ہمیں چائے پی لی

۲ - ہمیں چائے پی لے کو بیٹھی

۳ - ہمیں چائے پی

۴ - میں نے چائے پی لی (یہ دراصل عام رائج اردو ہو گئی لیکن حیدرآباد میں گفتگو اگر عورت کر رہی ہے تو کھانے کو بھی یوں ہی کہے گی کہ "میں نے کھانا کھا لی - میں نے خط لکھ لی - میں نے دروازہ کھول دی -")

اگر عثمانیہ یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس فرسٹ کا تمغہ لینے والا ایم - اے ، پاس مرد بھی کسی لڑکی یا عورت سے بات کرے گا تو اس کا لہجہ اور انداز ایسا ہو گا جیسے مخاطب کوئی مرد ہے - حالانکہ گفتگو عورت سے ہو رہی ہے -

" کل آپ وعدہ کر کے بھی نہیں آئے ، ہیں آپ کا کتا راستہ دیکھا -"

" آپ چوڑی دار پاجامے میں بہوت اچھے لگ رئے -"

" آپ اگر چوٹی نئیں ڈال کر بال کھلے بھی رکھے تو اچھے لگیں گے "

اب لڑکیوں کا اندازِ گفتگو (امراء کی بیٹیاں -) ملاحظہ کیجئے

" ہم آیں آج کالج نئیں جائیں گا "

" بابا جان ہیں عیدی ہیں آپ سے ہلو موتے کے کپڑے لیوں گا "

"اگے گل چمن بہری ہے کیا، میں کب سے بول رہا ہوں میرے کو پانی نہانے کا ہے۔"

یہاں بیگماتی زبان اور باندیاتی زبان میں کبھی تو زمین آسمان کا فرق ملے گا اور کبھی دونوں ایک ہی صف میں کھڑی نظر آئیں گی۔

حویلی کی مالکن بی پاشا اپنی نوکرانی کو پکار رہی ہیں۔

"اگے چھنال کدھر مر کو گئی۔ بہری ہو گئی کیا۔ کاناں پٹ ہو گئیں کیا۔"

نوکرانی اپنی ساتھی نوکرانی (کنیز) کو اس کے عشق کی واردات پر تنبیہ کر رہی ہے۔

"اگے چھنال، اسکے پیچھے مت دوڑ، حلال حرام میں تیئں تو ماں بن کو بیٹھ جائینگی۔"

پھر کسی حویلی میں آپ اس طرح کی زبان بھی بی پاشا سے سن لیجئے جو کوئی باندی کبھی نہیں کہے گی۔

"صدقے گئی میں حضورؐ کے۔ اچھا ہوا تو اللہ کرا، برا ہوا تو بندہ کرا۔ اجی آپ کاٹے کو ان کے بیچ میں پڑ تیں۔ شادی کرتے کرو، بولو نئیں کرتے مرد۔ اپنے کو کیا۔"

وہی بی پاشا جب کوسنے پر آئیں گی تو خواصوں اور باندیاں کو یوں نوازیں گی۔

"ایو کاں مر گئے گے۔ اپنا کفن سیتی بیٹھی ہوئینگی۔ جواب کیوں نئیں دیتی۔ چلنج میں پلنگ کا پھوڑا پھوٹا کیا۔"

کیا حیدرآبادی زبان کی یہ باریکیاں کسی اور نے تلاش کی ہیں ؟ میں حیدرآباد برسوں رہی، ان حویلیوں کے بیچ مہمان بن کر رہی —— جن کے بارے میں یہ سب کچھ لکھا ہے — اور دیکھ کر لکھا ہے، سن کر لکھا ہے۔ پھر میں کیسے یہ الزام صحیح مان لوں کہ میں نے خیالی پیکر تراشے ہیں — اگر میں جوناگڑھ میں رہی ہوتی، رام پور میں رہی ہوتی، یا جے پور میں رہی ہوتی تو یقیناً وہاں کے حالات لکھتی پھر حیدرآباد کے نہ لکھتی، لیکن لوگوں کا جو کہنا ہے کہ میں حیدرآباد کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہوں تو ظاہر بات ہے کہ جن زمینوں اور آسمانوں کے بیچ میں رہی ہوں۔ انھیں کی داستانیں رقم بھی کروں گی۔

اور یہ داستانیں اور افسانے میں نے اس لئے نہیں لکھے ہیں کہ لوگ انھیں پڑھ کر چٹخارے بھریں، واہ واہ کریں یا مجھے داد دیں۔ میں نے تو انھیں کاغذ پر یوں منتقل کیا ہے کہ میں جانتی تھی کہ اگر میں نے انھیں صرف محلوں اور حویلیوں میں ہی رہنے دیا تو وہ ہمیشہ کے لئے وہیں دفن ہو کر رہ جائیں گے — اور یہ "خزانے" اگر وقت کی تہہ در تہہ گرد میں گم ہو کر مدفون ہو جاتے تو حالات کی تیز آندھی بھلے ہی "کھل جا سم سم" کا کتنا ہی ورد کرتی رہتی وہ در کبھی وا نہ ہوتے۔

میرا سارا قصور یہ ہے کہ مجھے وہ منتر یاد تھا جو بند دروازوں کو کھول دیتا ہے۔

میں نے یہ کہانیاں لوگوں کو خوش کرنے، یا ناراض کرنے یا ناراض

کرنے کے لئے نہیں لکھی ہیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روشن پہلوؤں پر میں نے جو لکھا ہے۔ وہ آنسو پونچھنے کی ایک کوشش ہے۔ یہ بات سرے سے غلط ہے۔ میں صرف ایک بات جانتی ہوں کہ میں نے تو بس آئینہ دکھایا ہے! — میں نے اپنے قلم کے ذریعہ ہمیشہ مظلوم طبقے کا ساتھ دیا ہے۔ میری توجہ کا مستحق ہمیشہ نچلا اور پسا ہوا نچلا طبقہ رہا ہے، وہی نچلا طبقہ جو دراصل سب سے اہم ہوتا ہے، کسی بھی بلندی پر چڑھنے کے لئے سب سے پہلا قدم سب سے نچلی سیڑھی پر رکھا جاتا ہے۔ میں اس نچلی سیڑھی کی اہمیت کو جانتی اور مانتی ہوں — اور میری ساری ہمدردی ان آنکھوں کے ساتھ ہوتی ہے جو آنسوؤں سے بھری ہوتی ہیں۔

مجھے بتایا گیا ہے، یہ احساس دلایا گیا ہے کہ "آج سے اگر تم ایک لفظ بھی نہ لکھو تو بھی اردو ادب تمہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا — " حیدرآبادی ماحول پر لکھی گئی یہ تمہاری کہانیاں اردو ادب میں تمہاری یاد ہمیشہ قائم رکھیں گی —"

یہ تو لوگوں نے مجھے سنایا ہے۔

لیکن میں آپ سے بڑے اعتماد سے یہ کہوں گی کہ اردو ادب مجھے فراموش کرے یا نہ کرے یہ ساری کہانیاں آپ بھی فراموش نہیں کر پائیں گے — !!

واجدہ تبسم

بمبئی ۲۶ — ۱۲ — ۷۶

اُترن

(حیدرآبادی ماحول پر لکھی گئی کہانیاں)

(سن اشاعت: 1977)

واجدہ تبسم

پیش بندھی

دولہا میاں کے پانی نہانے کی تیاری کرلوگے چھوکریاں۔"

ممّا جانی کی آواز سنتے ہی دولہا میاں نواب ممتاز کے دل میں انار چھوٹنے لگے ۔

دولہن والوں کی حویلی سے باندیوں کی ایک پوری فوج کشتیاں سر پہ اُٹھائے ابھی ابھی سرخ حویلی میں وارد ہوئی تھی ۔ ان کشتیوں میں ہزارہا روپے کا سامان لدا ہوا تھا۔ کھانے پینے کے سامان کی تو قیمت ہی کیا، یہی ہزار دو ہزار کا رہا ہوگا۔ لیکن محض ریت رسم نبھانے کی خاطر جو بیش قیمت زیورسا اور کپڑے دولہا میاں کے لئے آئے تھے ان کی لاگت کوئی جوڑنے بیٹھتا تو لاکھوں سے بھی اوپر ہتی ۔ یہ کوئی بندھی ٹکی عام ریت تو تھی نہیں بس یہ تھا کہ نواب قدریار جنگ کے بزرگوں سے چلی آرہی تھی کہ جس دن دلہن اپنے گھر مایوں،

جیٹھی، دولہا کے لئے بھی زرد جوڑا، مٹھائیاں اور زیور بھولے ہی جاتے ۔ زیور کا تو نام ہی تھا ۔ بس ایک موتی کا ست لڑا ہوتا ۔ لیکن قیمت میں یہ ایک زیور ہی ہزاروں زیوروں پر بھاری ہوتا ۔ جوڑا ایسا ہی ہوتا جیسا نواب لوگوں کے گھروں میں پہنا جاتا ۔۔ ساٹن یا سَل سَل کرتی شامو کا تنگ پاجامہ اعلیٰ ریشم کا بند گلے کا کُرتا ۔ حیدر آبادی اونچی دیوار کی ٹوپی اور زرکا شیروانی یہ نواب ممتاز کے لئے جو شیروانی آئی تھی ۔ اس میں سیکڑوں پڑولے کے سچے موتی ٹنکے ہوئے تھے ۔ لیکن اس وقت جو نواب ممتاز کے دل میں چراغاں ہو رہا تھا تو اس لئے نہیں کہ ان کے لئے لاکھوں کا پہناوا آیا تھا ۔ یا وہ سونے سے پیلے اور موتیوں سے اُجلے ہونے والے تھے ۔ بلکہ ان کے اندر باہر ساری اُتھل پتھل تو یوں مچی ہوئی تھی کہ اب ان کے نہلانے کے سامان ہو رہے تھے اور محل کی یہ ریت تھی کہ دولہا مانجھے بیٹھنے کے لئے کبھی اپنے ہاتھوں نہ نہاتا ۔ بلکہ دولہن کے گھر سے آئی ہوئی چھوکریاں، سالیاں، رشتے کی ساری لڑکیاں اور پیلی نوکرانیاں یہ مبارک فرض انجام دیتیں ۔۔۔ بھئی عمر بھر تو آدمی اپنے ہاتھوں نہاتا ہی ہے ۔ یہ کوئی اس تپیائے ہوئے جسم سے پوچھے جسے بیک وقت کئی کئی کنوارے ہاتھوں کی ٹھنڈک نصیب ہونے والی ہو ۔

اور اصل میں تو یہ بھی بات نہیں تھی کہ نواب ممتاز محض چھوکریوں کے ہاتھوں نہانے کے نشے کی لذت کو مرے جا رہے ہوں وہ تو قصہ ہی دوسرا تھا ۔

انھیں معلوم تھا کہ آج چھوکریوں کی اس فوج میں وہ "پیش بندگی" بھی آئی ہوئی تھی جو ان کی دولہن کا کام کرنے ، اس کی پیشی میں سدا بندھی

رہنے کے لئے جہیز میں دی جانے والی ہے۔ افوہ یہ بھی کیا مزہ دار سلسلہ تھا! دولہا میاں کے تو وارے نیارے ہو جاتے۔ اس رواج کا سرا کہاں جا کر ملتا تھا پتہ نہیں۔ لیکن حیدرآباد کے اس مشہور نوابی گھرانے میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک بٹیا نے جنم لیا تو ایسی صورت تھی مانو بندریا۔ بچپن تو جوں توں کرکے کٹ گیا، اصل مصیبت جوانی آنے کے بعد آئی۔ پڑھ لکھ بھی گئی تھیں تو کیا ہوا ایسی صورت کون گلے لگاتا؟ لڑکی دیکھنے والے آئے تو مصیبت کی ماری ماں نے بیٹی کی جگہ ایک چاند کا ٹکڑا بٹھا دیا۔ دولہا والے دیکھتے ہی لٹو ہو گئے۔ آفت یہ تھی کہ شادی کے دن جو آرسی مصحف اور جلوہ نمائی ہوتی ہے اس سے کیسے نمٹا جاتا؟۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ٹھیک اسی لمحے جب آئینے میں صورت دکھائی جانے والی تھی۔ دولہن کو سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق سخت زوردار چکر لا دیا گیا۔ مونہہ لپیٹے سرخ گھونگھٹ میں دلہن وہیں ڈھیر ہو گئی۔ سب رتیوں رسموں سے فارغ ہونے کے بعد جب دلہن کو اس کمرے میں پہنچایا گیا اور پیچھے پیچھے دولہا میاں بھی شب بسری کے لئے شرماتے جھینپتے وارد ہوئے تو داخل ہوتے ہوتے انہیں ایسا لگا کہ اصل چاند تو دروازے کی اوٹ سے طلوع ہو رہا ہے۔ گوشت کی بو پا کر شیر لپکتا ہی ہے۔ یہ کون سی نئی بات ہے؟ دولہا میاں ذرا ٹھٹھکے جھجکے اور رک گئے۔ مگر وہ نہ ٹھٹھکی نہ جھجکی، مزے میں کھڑی مسکرا مسکرا کر انھیں پر چاتی رہی کہ اس مسکراہٹ کے صلے میں اس کے ماں باپ کا منہ پہلے ہی چاندی سے بھر دیا گیا تھا۔ لوگ میٹھے کی لالچ میں جھوٹا کھاتے ہیں۔ دولہا میاں نے پہل میٹھے سے کی۔ بعد کو جھوٹا کھانا پڑے سے تو جو بی بی

اس وقت تو تر مال سامنے تھا!

بعد میں سسرال والوں نے بڑی لے دے مچائی کہ کون سی لڑکی بتائی، کون سی بیاہ دی، ؟ لیکن دولہا میاں ایسے شریف تھے کہ کبھی بے چاروں نے گلہ نہ کیا۔ کہہ دیا "میری قسمت میں جو تھا میرے کو مل گیا۔ اب میرے کو کسی سے خطی کوئی گلہ نہیں۔" اور پھر پورے حیدرآباد میں یہ ریت ہی پڑ گئی کہ جہیز میں دولہن کے کام کاج کی خاطر کوئی طرحدار سی لونڈیا ساتھ کردی جائے جو ہر دم دولہن کی پیشی میں بندھی رہے۔ دلہن کے کام کا تو بس نام ہوتا "اصل کام تو دولہا کا ہوتا۔

حویلی میں جب بھی کسی شادی کی تام جھام مچتی سارے لڑکوں میں رسہ کشی ہوتی رہتی کہ دیکھیں اس کے نصیب میں اب کے کون سی پری جمال لکھی ہوئی ہے ایسا بھی بارہا ہوتا کہ شریف لڑکے نظر اٹھا کر پیش بندھی کو دیکھتے تک نہ تھے۔ انھیں جو کچھ بھی مطلب ہوتا اپنی بیاہی دُلہن سے ہی ہوتا۔ لیکن ایسے پارسا تھے کتنے ؟ اور جو ایسے پارسا ہوتے بھی تو انھیں دوستوں کے طعنے سننے پڑتے "یا تم میں کچھ کمی معلوم پڑتی ہے۔ نئیں تو یہ کیا بات ہے کہ شیرینی تمہارے ہونٹوں کے اتنے قریب، ہور تم ہونٹاں چاٹتے تک نہیں ؟"

مرد سب کچھ سہہ سکتا ہے مردانگی پر طعن نہیں سہہ سکتا۔

اور نواب ممتاز بھی انھیں میں سے تھے جو ٹھنڈے پانی کی تلیا میں ٹبکی لگا دینے کو سعادت سمجھتے ہیں۔

ایک دم رشتے کی بہنوں، سالیوں کا پرے کا پرا دوڑتا آیا اور ان کا

ہاتھ زور سے پکڑ لیا گیا۔

"اللہ ممتاز بھائی چلونا ۔ آپ کو پانی نہلا کو ممتا جاتی سے نیگ منگیں گے ۔"

گھسٹتے ہوئے وہ لڑکیوں کے ہجوم میں کھنچے چلے گئے "مایوں نہلائی" کی رسم بند حماموں میں نہیں، ڈنکے کی چوٹ کھلے آنگن میں آسمان تلے ہوتی ہے جہاں چار سہاگن بیبیاں زرکار شامیانے کی ڈوریاں پکڑ کر چاروں طرف کھڑی ہو جاتی ہیں ۔ پانچویں سہاگن پہلے دودھ سے سر دُھلاتی ہے اور پھر ساری لڑکیاں دولہا پر ٹوٹ پڑتی ہیں ۔

"غم یہ ہے کہ نامراد شادی زندگی میں ایک بار ہوتی ہے ۔"

نواب ممتاز نے دل میں سوچا اور لڑکیوں بالیوں کی سرسراتی انگلیوں کی بے پناہ گدگدی سے جسم چرانے لگے ۔

" اگے اے گل چمن گدگدی کیوں کر رئی گے ؟ دکھتا نہیں کیا دولہا میاں کو برابر سے بیٹھنا بھی نئیں آریا ۔؟ " ایک شریر سی لڑکی نے چھبتے ہوئے لہجے میں مسکرا کر اس لڑکی سے کہا جو نواب ممتاز کی پیٹھ پر کلیاں بکھیر رہی تھی ۔

وہ چھن سے ہنس پڑی

نواب ممتاز نے ذرا سا پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ انھیں ایسا لگا کہ وہ جادو کے اثر سے پتھر ہو گئے ہیں ۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اب پیٹھ سے ہوتے ہوئے وہ موسیقی بھری انگلیاں ان کے شانوں سے ہوتی ہوئی پنجوں کی طرف آ رہی ہیں ابٹن اور مہکتے مسالے کی جی لوٹ پوٹ کر دینے والی خوشبو میں ڈوبتے ڈوبتے اُبھر کر انھوں نے دیکھا ۔ لمبی لمبی کافوری انگلیاں جن کے سروں پر ناخون

کی بجائے یاقوت ٹنکے ہوئے تھے۔ دھیرے دھیرے ان کے حواس پر گر رہی ہیں۔

گل چمن — ؟ انہیں یاد آیا، یہی نام تھا، یہی پکار تھی جو اتنے دن سے ان کے کانوں میں پڑ رہی تھی کہ دلہن کے ساتھ گل چمن پیش بندھی آ رہی ہے اب پیٹھ سے فارغ ہو کر وہ سامنے آ گئی تھی — پیر دھلانے وہ سامنے آئی تو نواب ممتاز اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔۔

کم بخت کمر تھی یا وہم ؟

انہوں نے دل ہی دل میں شہادت کی انگلی سے انگوٹھا ملا کر گول چھلا سا بنایا اور پھر خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ اونہوں ! یہ چھلّا بڑا پڑے گا۔ کمر تو اس سے بھی پتلی ہے نامراد کی۔

وہ بڑے انہماک سے رگڑ رگڑ کر پیر دھلائے جا رہی تھی۔ گھنے بالوں کے گچھے پیشانی پر جھول رہے تھے۔ گیہوں رنگ تپ کر سرخی مائل ہو رہا تھا۔ کرتا خدا کا شکر ہے بند گلے کا تھا، مگر پھر بھی صاف ظاہر تھا کہ اندر جو بھی تھا اپنے آپے میں نہیں تھا۔ اُبھر آنے پر کمر بستہ تھا اور یہ ساری دھاندلی پیٹ کی پیٹیوں کی تھی۔ نہ پیٹ ایسا چپاتی ہوتا نہ اُبھاریں نمایاں ہوتے۔

اسی دم پیچھے سے کوئی پکارا "ایّو! گل چمن کدھر مر گئی۔ اس کا چھوکرا رو رہا ہے۔

چھوکرا — ؟ نواب ممتاز نے دل ہی دل میں سوچا۔ پھر وہ خوش ہو گئے۔ بہت سے لوگ کچے پھل کے شوقین ہوتے ہیں۔ نامرادوں کو پتہ ہی نہیں کہ پکا ہوا پھل کیا چیز ہوتی ہے! ارے کچے پھل میں وہ بات کہاں جو

پکے ہوئے رس دار پھل میں ہوتی ہے ۔۔ ذرا ہاتھ لگاؤ اور ٹپ سے جھولی میں
پانچویں دن شادی تھی ۔

مایوں سے لے کر شادی تک کے پانچ دن ممتاز نواب نے کیسے گزارے
اس کا پتہ صرف ان کے اپنے دل کو تھا ۔ ان کی تو دلہن بھی بڑی خوبصورت
اور نازک، کانچ کی گڑیا سی تھیں ۔ لیکن وہ کمر جو جانے تھی بھی یا نہیں، ان کے
وجود کو تہہ و بالا کر گئی تھی ۔ وہ ہنسی جو چھن کر کے ان کے حواس پہ گِری تھی، وہ رنگ
وہی رنگ جو جنت سے آدم کے اخراج کا باعث بنا تھا۔ وہی دانۂ گندم
کا رنگ جو تپ تپ کر سونا بن گیا تھا انھیں رہ رہ کر للکار رہا تھا۔ "کھا کر
دیکھو، کیسا نشہ آتا ہے !"

کیسی عجیب بات تھی ۔ ایسا بھنورا جو زندگی بھر کلی کلی کا رس چوستا آیا
ایک ایسی کلی کے پیچھے دیوانہ ہو رہا تھا جو "مونہہ بند" تھی بھی نہیں ۔

شادی کی ریت رسمیں ختم ہوتے ہی میں نہ آتی تھیں ۔ اور ادھر نواب
ممتاز ضبط کی حدوں سے گزرے جا رہے تھے ۔ جی تو کہتا تھا یہ سہرا دو سرا اٹھا
کر پھینکو اور ایک ہی تھما کے میں گود میں پڑی بندھی کو بھر کر کسی کونے کھدرے
میں جا دبکو ۔ لیکن ڈیوڑھی کی ریتیں رسمیں ۔۔ اللہ اللہ !

ساری فضول رسموں سے فراغت ہو گئی تو دولہا نواب نے اپنی بھاوج
کو بلا کر رازداری سے کہا " بھابی جان میں آپ کو جتائے دے رہا ہوں کہ اگر
کوئی نے بھی میرے کمرے میں جھانکا تو میں صبح اس کا کھوپڑا پھوڑ دوں گا۔"

نئے دلہن دولہا کے کمرے میں تاکنے جھانکنے کا سلسلہ بے حد عام
تھا بے چارے بھولے اور شریف قسم کے لڑکے تو یہ بات جانتے بھی نہ تھے ۔۔

اس لئے بُرے پھنستے۔ صبح کو ان کی وہ ہنسی اڑائی جاتی کر پھر دلہن کے کمرے کی طرف قدم اٹھانے کی بھی ہمّت نہ ہوتی — جو جہاں دیدہ ہوتے وہ دروازوں کی جھریوں پر کان چپکا کر نچنت ہو جاتے۔ بات بھی کرتے تو سرگوشیوں میں اور جو اناڑی ہوتے تو ان کے بوسوں کی پٹاپٹ بھی چار کمرے دور تک سنائی دیتی اور اس کا بھگتان بھی وہ دوسرے دن بھگت لیتے۔

ممتاز نواب چاروں کھونٹ چوکس تھے وہ ہر طرح اپنا انتظام پورا کر چکے تھے۔ آخر دو معرکوں سے گزرنا تھا غافل کیسے رہتے؟

بھابی جان ہنسیں اور شوخی سے بولیں" میں تو کسی کو آنے نہ دیں گی۔ مگر تنہائی کا اتنا بھی ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ کہ صبح کو بے چاری دلہن کو اٹھنا بھی نہ آئے۔"

"دُلہن کو؟" نواب ممتاز دل ہی دل میں ہنس دئے۔

دُلہن کی سیج ممّاجانی والے کمرے سے ہٹ کر بڑا کمرہ جو تھا اس میں سجائی گئی تھی۔ دلہن کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ایک اور کمرہ نما راہ داری تھی اسی راہ داری میں پیش بندھی کو رہنا تھا کہ دلہن کو کام وام پڑے تو زیادہ دوری نہ رہے۔ لیکن اتنا زیادہ نزدیک بھی نہیں کہ دولہا دلہن کی بات چیت بھی پیش بندھی سُن لے۔ ایک دروازہ دلہن کے کمرے میں تو تھا ہی، ایک راہ داری کا کمرہ نما جو تھا اس میں بھی تھا — اور یہی دراصل نواب ممتاز کے ارمانوں کی سیج تھی ساری لڑکیوں، بالیوں، میراثنوں، اور ٹلٹر بازیوں کو پیچھے چھوڑ کر نواب ممتاز راہ داری میں داخل ہوئے اور دروازہ بند کر لیا۔

سامنے ایک پلنگڑی پر دہی گُل چمن مسکراتی ہوئی بیٹھی تھی جو سارے

گلوں اور جمنوں کا نچوڑ تھی ۔ دو مسکراتے ہوئے ہونٹ — جیسے رس بھرے سنہرے آم کی اوپر تلے دو قاشیں رکھی ہوں اور کہتی ہوں، "لیو اور چوس ڈالو" ہونٹوں کا صحیح مصرف تو آج ہی نواب کی سمجھ میں آیا ۔) وہ جو پانچ دن سے ترس رہے تھے ۔ اور یہ سوچے ہوئے تھے کہ ایک دم ٹوٹ ہی پڑیں گے ۔ قدرت کی اس صناعی کو حیران حیران کھڑے دیکھتے رہے ۔ چونکے تو اس وقت جب ان کے کانوں نے یہ سنا : "کپڑے اتار دیوں ؟"

نواب ممتاز بوکھلا گئے — "کپڑے اتار دیوں" ؟" وہ جو زندگی بھر ہزاروں لڑکیوں کے کپڑے تار تار کرتے آئے تھے ۔ اس لیظا ہر آسان سے سوال سے سٹ پٹا گئے — وہ سوال جوان کی ملکیت کر رہی تھی ۔

"کیوں ؟" ایک عجیب احمقانہ سوال ان کی زبان سے نکلا ۔

وہ ہنسی — اس قدر بے باکی سے ہنسی کہ ان کے اندر کا مرد بیدار ہو گیا ۔ "کپڑے کا ٹیکو اتارا کرتے ہیں نواب صاحب — آپ نا اتا بھی نہیں معلوم ؟

انھوں نے پاگلوں کی طرح دلہن کے دروازے کی کنڈی باہر سے چڑھائی اور بیتیس بندھی پر ٹوٹ پڑے ۔

جب ہونٹ چاٹتے ہوئے وہ اس عارضی سیج سے اٹھے تو خوش ہو کر انھوں نے بٹوہ کھولا اور کھن کھن کرتے بیس روپے اس کی لرزتی ہوئی ننگی ہتھیلی پر رکھ دیئے ۔

وہ ابھی تک اسی جوڑے میں ملبوس تھی جو عورت نے دنیا میں پہلا قدم رکھتے ہوئے پہنا تھا ۔ لیکن روپے پانے کی خوشی میں اپنی برہنگی سے بے خبر

وہ کھٹ سے اُٹھ بیٹھی — ایک، دو تین چار، پانچ کر کے اس نے اسی دم سارے روپے گن ڈالے — اور نواب جو اتنی دیر میں ذرا آگے جا چکے تھے۔ جا کر انھیں جھنجھوڑتی ہوئی بولی "یہ روپے — یہ بیس روپے آپ میرے کو دیئے ؟"

نواب دھیرے دھیرے پھر پلٹ آئے۔ مسکرا کر کہا، "ہاں"
وہ اسی دیوانگی بھری خوشی سے بولی "صرف ایک بار کے واسطے ؟"
نواب نے ہاں میں سر ہلایا تو وہ لجاجت سے ان کا ہاتھ پکڑ کر بولی، "تو ایک بار ہور — بس ایک بار ہور" وہ گڑگڑائی۔
نواب ممتاز نے غور سے اسے دیکھا وہ پتہ نہیں کیا سمجھی۔ پھر گڑگڑا کر بولی۔
"بچے کو تو میں افیون کھلا کر سلا دی ہوں — وہ ہرگز نہیں اُٹھنے والا۔ آپ کو خسم ہے۔ بیس روپے بہت ہوتے، نواب صاحب یہ تو میرے سال بھر کا خرچہ ہے۔ میرا مرد کتا خوش نہیں ہوئیں گا۔!"
تیرا مرد ؟ نواب ممتاز ٹھٹھک گئے۔

ہو نواب صاب وہ دلہن بی کی حویلی میں دربان ہے۔ مگر کتی کم تنخواہ ہے کہ ہمارے بچے کو دودھ ملتا نا ہم کو چاول۔ یہ بیس روپے تو نواب صاب سال بھر سے زیادہ چلیں گے۔"

نواب صاحب نے ابھی ابھی جو نشہ پیا تھا سر سر کر کے سارے کا سارا اتر گیا۔ انھیں اپنے حلق میں کھاری پن کا احساس ہوا۔ کیا آنسوؤں سے ان کا حلق تر ہو رہا تھا۔؟ انھوں نے رکتے ڈوبتے لہجے میں پیش بندی سے پوچھا۔ "تیرے میاں کو معلوم ہے کہ آج رات تو کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے ؟"

" معلوم ؟ اجی نواب صاب اس سنے تو خوشی خوشی یہ بول کو میرے کو بھیجا تھا کہ نواب صاب کو ضرور خوش کرنا۔ وہ پانچ روپلے سے کم نہیں دیں گے مگر آپ تو ...... " اور مارے خوشی اور احسان مندی کے اس کی آواز گھٹ سی گئی ۔

نواب صاحب خاموش ہو گئے ۔ صدیوں کی خاموشی جیسے ان کے وجود پر چھا گئی ۔ وہ کہے جارہی تھی ۔" آپ کو نئیں معلوم نواب صاب پیش بندھی بننا کتنی خوش قسمتی کی بات ہے ۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ دولہا میاں آپ کا سا دل والا بھی ہو ... "

تو پڑھی لکھی بھی ہے ؟" نواب صاحب پاتال میں سے بولے

" پڑھی لکھی ؟ " وہ ذرا طنز سے ہنسی " ہاں اتی پڑھی لکھی تو ہوں جو یہ جان پاؤں کہ چاند چمکتا بھی ہے تو ہم غریبوں کے گھروں میں اندھیرا ہی رہتا ہے ہور یہ کی روپیہ ۔" اس نے ایک کھن کھناتا روپیہ نکال کر نواب ممتاز کو دکھایا یہ روپیہ جو ہے اس میں چاند اور سورج سے بھی زیادہ چمک ہوتی ہے ...."

نواب ممتاز پتھر بنے سُن رہے تھے ۔ وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رودی ۔" پیش بندھی بننا کتا بُرا ہے نواب صاب ۔ آپ یہ سوچ کی میں اتی شرمیلی لڑکی ہوں کہ اپنے میاں کو چراغ بجھائے سوا اپنے پاس پھٹکنے بھی نئیں دیتی مگر پیسہ ۔ یہ پیسہ ۔" اس نے بیسیوں کے بیس روپلے کھن کھن کر کے فرش پہ پٹخ دیئے ۔" اس پیسے کے مارے میں اپنے سارے کپڑے آپ اتار دوں کہ آپ کو پرچا لیوں ، نئیں تو آپ یوں ہی چلے جاتے اور یہ تو میری آمدنی کی رات تھی ۔ پیسے کے واسطے بے شرم بننا اچ پڑتا ہے نواب صاب"

نواب ممتاز نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے گلے سے موتیوں کا ست لڑا اُتارا اور اس کے پیروں، میں ڈھیر کرتے ہوئے بولے "تو اسی وخت اپنے میاں کے پاس چلی جا۔ الفاظ آنسوؤں کے بوجھ سے ان کے گلے میں ٹوٹ رہے تھے۔" شائد یہ تیری زندگی بھر کو کافی ہو جائیں گا۔ بہت قیمتی ہار ہے"

اس نے ہار اٹھاکر نواب صاحب کے گلے میں ڈال دیا۔ اور ٹوٹے ٹوٹے لفظوں سے بولنے لگی، "یہ ہار تو میرے کو اکیلی کو زندگی بھر کو کافی ہو جائیں گا۔ مگر حیدر آباد میں کتی ساری غریب چھوکریاں ہیں نواب صاب، جن کو کبھی نہ کبھی تو پیٹ کے واسطے پیش بندھی بن کو، پیسہ کمانے کو دولہوں کو پر جانا پور سیج سجانا پڑیں گا۔ نواب صاب آپ بڑے آدمی ہیں، آپ میرے کو آج یہ وعدہ دیو کی حیدر آباد سے اس لعنت کو آپ ختم کر کے اپچ دم لیں گے دلہن کے واسطے کام کاج کے واسطے جائیں گی بھی تو کوئی بڈھی عورت ــــ میرے ایسی جوان لڑکی نئیں جس کے دل میں پیار تو اس کے میاں کے واسطے ہو، ہور جسم دولہوں کے سیج پو۔"

میں اکیلا ــــ حیدر آباد اتّا بڑا۔ میں کیسے اس خبیث ریت کو توڑ سکوں گا گل چمن، ؟" نواب ممتاز کے لہجے میں گہرے دُکھ اور کرب کی چھاپ تھی۔

وہ بڑے اعتماد سے بولی "آپ کو اتّا بھی نئیں معلوم نواب صاحب کی گھور اندھیرے میں روشنی پھیلانے کو ایک چراغ اچ بھوت ہوتا۔

نواب ممتاز نے غور سے اس حوصلہ مند لڑکی کو دیکھا جو انھیں اندھیروں سے روشنیوں کی طرف بلا رہی تھی۔ ان کی سوچتی ہوئی آنسو بھری آنکھوں نے ایک فیصلہ کر لیا اور انھوں نے اپنے سر سے زرتار صافہ اتار کر اس کے برہنہ جسم پر ڈال دیا

ناگن

"ایّو پاشا - جلدی سے پردہ کرلیو - بڑے سرکار اُدر ج آریئں"
مغلانی بی کی چھوکری کریمن کی آواز سنتے ہی مہر آراء ایک دم زنان خانے کی طرف لپکی -

حویلی میں بے حد پیاری اور حواس گم کر دینے والی شام کا افتتاح ہو رہا تھا - خواجہ سرا فانوسوں میں رکھی ہوئی شمعیں روشن کرتا ادہر اُدہر آجا رہا تھا - مالن موتیا کی مست کر دینے والی خوشبو سے لدے تازہ کھلے پھولوں کے گجرے سب کے کمروں میں رکھتی پھر رہی تھی - بڑی طرف صحن میں کا مدار نے خس کی جھاڑو سے آنگن صاف کر کے گلاب اور عنبر کے پانی سے چھڑکاؤ کرنا شروع کر دیا تھا مہر آراء گرما کی شام کو صندل کے پانی سے غسل کر کے حمام سے نکلی ہی تھی - ابھی جوان جسم کی مہک صندل سے پوچھ ہی رہی تھی کہ تم زیادہ تو بہ شکن ہو یا میں ؟

کہ کریمن کی آواز نے اسے بولا دیا۔ لانبے لانبے بالوں میں سے ابھی موتی ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر ہی رہے تھے، ابٹن کی خوشبو ابھی حسین سراپا کے گرد طواف کر ہی رہی تھی، حسین آنکھوں میں جو پہلے ہی کم قاتل نہ تھیں۔ سیکا کائی پڑ جانے سے گلابی ڈورے گہرے ہو کر قتل عام کی دعوت دے ہی رہے تھے کہ کریمن کی آواز آئی اور آواز بھی کیا کہ بڑے سرکار اُدر پچ آرئیں ــــ" اس نے سوچا "ہائے اللہ اگر مجھے اس انداز میں دیکھ لیں تو ـــ ؟ انوں تو آگے اچ ہزار بار تاک جھانک کرتے کو بیٹھے ہیں ـــ ایسے میں تو اماں بی بھی گھر سے باہر ہیں ـــ"

اس نے بے حد سہم کر یہ سب سوچا ضرور، مگر قریب ہوتی ہوئی رات نے، حواس چھین لینے والی عنبر، موتیا صندل اور ابٹن کی خوشبو نے کچے آنگن کی عطر گل کی مہک نے، گنگنے پانی والے غسل کی حیات بخش لذت نے اور تین سال سے خود اس کے اپنے تڑپتے تڑپاتے ارمانوں نے یہ بھی سوچا۔ ایسی حسین شام کو اگر مجھے وہ ایک ہی بار قریب کر لیں تو؟"

پتہ نہیں اس کے خیالوں نے بڑے سرکار کو آواز دی تھی یا انھیں بھی خوشبوؤں نے بڑھاوا دیا تھا۔ یا تنہائی اور بے پناہ تنہائی نے ان کی ہمت کو للکارا تھا وہ سوچتے ہی الہ دین کے جن کی طرح وہیں حاضر تھے۔ اپنے پورے اونچے بھاری بھر کم قد اور فدا ہو جانے والے انداز کے ساتھ ـــ اور کوئی وقت ہوتا تو وہ ادھر زنانے میں قدم بھی نہ دھرتے، مگر اس وقت ان کے نصیب سے پوری حویلی خالی تھی۔ سب لڑکیاں بالیاں، نوکر، چاکر، حویلی سے گئے ہوئے تھے۔ بھلا اماں بی کہیں جائیں تو پوری فوج ساتھ کیسے نہ جائے۔ وہ تو ایک اتفاق تھا کہ مارے گرمی کے مہرآرا کا جی الٹ پلٹ ہو رہا تھا تو اس

اماں بی سے معذرت کرلی تھی کہ وہ بالکل نہیں جا سکتی، اسے گھر پر رہنے کی اجازت دے دی جائے کہ صندل کے پانی سے غسل کرکے ذرا تراوٹ حاصل کرلے دبلے اور وسوسوں والی امنی نے پہلے تو ذرا شک سے مہر آرا کو دیکھا، لیکن بھولے بھالے چہرے پر کسی بھی قسم کی گھبراہٹ نہ پاکر کہہ دیا۔ "کرمین سے بول دیو۔ صندل والا پانی تیار کرنے کو رکھ دے۔ پراتی بات، یاد رکھو کہ نہا کو ایک دم کھلے آنگن میں مت نکل کو آنا — چپ کے چپ، نہیں تو بخار و خار آجائیں گا۔ ہور بالاں پچھے سے پونچھنا۔ سب احکام قبول کرکے مہر آراء جانے لگی تو اوپر سے اتنا اور سنا دیا۔" ہور سنو، بی بی شام پڑے عطر و طر مت لگانا، بن ناحق الٹ پلٹ ہونے کو —"

اور جو جوان جسم کا عطر خود یہاں سے وہاں تک نیتوں کو ڈانواں ڈول کرتا پھر رہا تھا؟ اس کے بارے میں اماں بی کوئی ہدایت کیا دے پاتیں — اور ساری آگ تو اسی کی لگائی ہوئی تھی جیسے ہی مہر آراء اپنے آراستہ سرخ محل میں پہنچی (اماں بی نے سب لڑکیوں کو انہیں کی پسند کے مطابق ایک ایک کمرہ لیپا عنایت کر دیا تھا۔ جس میں دیواروں سے لے کر قالین، پردے، دیوان، چادریں غلاف اور فانوس تک پسند کے ہی رنگ کے لگوائے جاتے تھے۔ مہر آراء سرخ رنگ کی دیوانی تھی۔ اس کے حصے میں سرخ محل آیا تھا اس کے سراپے میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ تنہائی کی بھرپور شہ پاکر بڑے سرکار بھی ادھر ہی کھنچے چلے آئے اور گلاب رنگ کلی دیکھ کر آئینے میں زور سے ہنس پڑے مہر آراء نے لرز کر، گھبرا کر، سہم کر آئینے میں دیکھا اور پھر ایک دم پیچھے پلٹ پڑی اور یوں بڑے سرکار کا سامنا ہو گیا جب جب کچھ نہ سوجھا تو مارے گھبراہٹ کے جانے کیسے اسے آداب محفل یاد آ گئے — سر کو جھکا کر نازک سے حسین پیشانی کو چھو کر —

بولی "آداب عرض ہے۔"

بڑے سرکار اس وقت بڑی موج میں تھے آگے بڑھ کر اُسے پوری کی پوری اپنے بازوؤں میں بھر کر بولے "ہم تو مرد ہیں مرد — اور جانتی ہو۔ مرد سلام کا جواب کس طرح دیا کرتے ہیں۔ ؟"

مہرآرا اس اچانک وار کے لئے قطعاً تیار نہ تھی — بغیر کسی گہما گہمی کے، بغیر تاشے باجوں کے، بنا کسی دھوم دھڑکے کے، بنا کسی تیاری کے، یہ اچانک سہاگ رات کیسے آ گئی۔ لیکن ٹس ٹس کرتی جوانی نے اسے کچھ سوچنے اور بچاؤ، کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ بڑے سرکار نے ایک مرد ہی طرح اس کے آداب کا جواب دیا — اور ایسا جواب ؟ مارے ترنم، گھبراہٹ اور مسکراہٹوں کے بوجھ کے اس کی آنکھ اوپر اٹھتی تھی، نہ کھلتی تھی۔

طلسم اس وقت ٹوٹا جب کریمن دودھ کا گرم گرم پیالہ پاشا کے لئے لے کر آئی۔ بڑے سرکار کنڈی چڑھائے بیٹھے تھے کھڑ کھڑ پر درواز کھولنے گئے یہ بھی نہ سوچا کہ کریمن کیا سوچے گی، بھڑ سے دروازہ کھلا اور ایک دیوزاد کی طرح انھیں چھپایا دیکھ کر یمن کے ہاتھ پر را گرم گرم دودھ ان کے پیروں پر گر پڑا۔ ان کے موہنہ سے "سی" کی آواز نکلی اور کھُلے بالوں کی گھٹا لہراتی مہرآرا اپنے پلنگ پر سے کود چوکھٹ میں کھڑی ہوئی کریمن کے سر پہ جا سوار ہوئی اور پورے بیویوں والے انداز میں ڈانٹ کر بولی ۔" ہوری اندھی ہے کیا ؟ وہ تو اچھا ہوا کہ ان کے پاؤں بیں جرابیں تھیں۔ ہو کبھی چھالے والے پڑ جاتے تو ؟" صرف دس منٹ کی قربت نے کس قدر اسے بیبیانہ سا بنا دیا تھا۔ لیکن کریمن اس انداز سے کہاں سوچ سکتی تھی۔ اس نے کھلی آنکھوں سے بس یہی دیکھا کہ بڑے سرکار اور

پاشا ایک کمرے میں بند تھے۔ اس آنکھوں کی اندھی نے چہرے پر چمکتے چاند دیکھے نہ سانسوں میں مہکتا عطر دیکھا۔ گالوں پہ کھلتا گلال دیکھا، نہ آنکھوں میں محبتوں کے چمکتے ستارے پرکھے، وہ یہ سب دیکھتی بھی کیوں اور کیسے؟ اس کا تو کام ہی یہ تھا کہ رخصتی تک بس مہرآراء پر کڑی نگاہ اور پابندی رکھے اور لاکھ نکاح ہو بھی چکا تھا۔ تب بھی اس کا فرض تھا کہ بڑے سرکار کو اس کے کمرے میں آنے سے روکے ۔۔۔ خدا رسول کی نگاہ میں تو وہ ایک ہو ہی چکے تھے اور یہ کوئی گناہ انھوں نے کیا نہیں تھا ۔۔۔ لیکن دنیا والوں نے بھی کچھ اپنے اصول بنا رکھے ہیں ان کو بھی تو نبھانا ہی پڑتا ہے۔

ہوا یہ کہ مہرآراء چونکہ بے حد حسین تھی اور بصالت جنگ یعنی بڑے سرکار (جو دراصل چھوٹے سرکار تھے مگر بھائیوں میں بڑے ہونے کی وجہ سے بڑے کہلاتے تھے) اسے ایک شادی کی محفل میں دیکھ کر داری صدقے ہو چکے تھے، اس لئے چاہتے تھے کہ کسی بھی حالت میں اسے دلہن بنا کر ہی دم لیں ۔۔۔ ادھر مہرآراء بھی معمولی لڑکی نہیں تھی ایک بڑی جاگیر کے مالک نواب باپ کی بیٹی تھی اس کی اہمیت یوں بھی زیادہ تھی کہ ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی، اور پانچ بھائیوں کی بہن تھی۔ قاعدے کے مطابق جب بصالت جنگ کا پیام بڑی حویلی میں بھجوایا گیا تو لڑکی والوں کو ان میں ایسی کوئی بات ہی نظر نہ آئی۔ کہ پیام رد کیا جاتا۔ ہر لحاظ سے ہر معیار پر پورے اترتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ بھی ایک حماقت کی رسم چلی آرہی ہے کہ اپنی بڑائی جتانے کو خواہ مخواہ "ہاں" کہنے میں دیر کی جائے، اس لئے یہی حماقت اس وقت بھی لڑکی والوں نے کی ۔۔۔ اور ویسے یہ حیدرآباد کا پرانا دستور رہا ہے کہ بعض مرتبہ عمداً اور

بعض مرتبہ بالکل اکڑ جاتے کو۔ بس لڑکی کا عقد پڑھا دیتے ہیں۔ اور رخصتی سال دو سال کے بعد کے لئے اُٹھا رکھتے ہیں۔ عموماً میں یہ ہوتا ہے کہ کئی بار لڑکی تعلیم حاصل کر رہی ہوتی ہے۔ یا اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ شادی کے یا گھر بار سنبھالنے کے قابل ہی نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ لڑکا اچھا ہے۔ ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اس لئے صرف عقد پڑھوا لیا جاتا ہے۔ اور بعد میں ایک اور زور شور کے ہنگامے کے ساتھ مقررہ مدت کے بعد دلہن کو رخصت کیا جاتا ہے۔ کہاں تو بصالت جنگ مہر آراء کے وصال کے لئے مرے جا رہے تھے اور کہاں انھیں بھی اسی دوہری شادی کے چکر میں پھنس جانا پڑا۔ یا تو یہ طے کئے بیٹھے تھے کہ شادی ہوگی اور جنت کے مزے لوٹیں گے، یا یہ ہوا کہ صرف عقد یہ بات ٹھانی تھی اور فرقت کی آگ کو دوزخ کی تپش سے بڑھ کر جھکتا۔

مہر آراء پہ ان کا دل آ جانا کوئی ایسی انہونی بات تھی بھی نہیں۔ حسن کی مورت تھی، شباب کا عالم تھا۔ پھر انہوں نے تو اسے اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا اور سنا تھا۔ جو حیدر آبادی اور یوپی کی ملی جلی زبان بولتی تھی۔ جو "نکو" بولتی تھی، "اماں بی" بولتی تھی، مگر لہجہ یوپی والوں کا سا تھا۔ جس نے گھر پر رہ کر دہلی والی استانی سے تعلیم حاصل کی تھی، جس نے دور ہی دور سے جلوہ دکھا کر انھیں اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔ اور دراصل ساری گڑبڑ یہی تھی کہ چونکہ انھوں نے اسے ایک شادی کے ہنگامے میں دیکھا تھا، اس لئے شادی کی مناسبت سے اس نے کپڑے بھی ایسے جھل جھل پہن رکھے تھے، زیور بھی ایسا جھکا جھول اور جگر مگر کرتا سجا رکھا تھا کہ نہیں آتا ہوا دل آ جاتا۔

پہلے تو دولہا والوں نے بہت ہیر پھیر کی۔ بہت باتیں بنائیں کہ شادی رخصتی سب ساتھ ساتھ ہو جائے۔ مگر دلہن والوں کی ایک نہ ہزار نہ ۔۔۔ وہی اڑ کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے، پڑھ رہی ہے۔ اور حقیقت یہ تھی کہ ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ یہ ضرور تھا کہ مہرآرا ابھی کلی سے پھول کی مانند کھلی تھی۔ لیکن کیا کم سنی میں شادیاں نہیں کی جاتیں۔ مگر وہاں تو سارا سلسلہ یہ تھا کہ لڑکی کا مان بڑھایا جائے۔ بڑے نواب صاحب ہمیشہ کہتے تھے ۔۔۔ ادھر پیام آیا ادھر شادی کر دی تو لڑکی کی کوئی قدر نہیں رہتی۔ جب تک جوتے کا تلا اور چوکھٹ ایرا پھیری میں گھس نہ جائیں وہ شادی ہی کیا ہوئی۔" اور اب انکی خواہش کے مطابق مشا طرپی کا مدار جوتا گھسنے کے قریب آچکا تھا۔ اور حویلی کی چوکھٹ ان کے جوتے کی رگڑ کھاتے کھاتے دھول اڑانے لگی تھی۔ اور شادی کی تاریخیں قریب سے قریب آرہی تھیں کہ جوانی کی بے تابی کے ہاتھوں یہ گل کھل گیا۔

کریمن بار بار ہر دم ڑنے کو لپکی کہ کسی نہ کسی کو یہ راز سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کرے کہ بڑے سرکار نے کس کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ پہلے ہی باولی ہو رہی تھی اب تو بالکل ہی گڑبڑا گئی۔

"پہلے وعدہ کرو یہ بات کسی سے نہ کہو گی" ایک تو بڑے سرکار غب داب ہی ایسا تھا۔ اس پر دہلی والی ماں کے بیٹے تھے کہ بات کرتے میں جن کے منہ سے پھول جھڑتے تھے ۔۔۔ کریمن کے منہ سے کچھ نکلتا تب نا جب تک وہ اپنا منہ اس کے حوالے کر چکے تھے۔ جس میں کی سوجالی روپیے جھن جھنا رہے تھے۔

پیسہ اگر سب سے بڑی طاقت نہیں تو بہت بڑی طاقت ضرور ہے۔ کرین نے اپنا موہنہ سی لیا۔ لیکن مہر آرا، جو نرم گرم بوسوں کے سحر سے اب آزاد ہو چکی تھی پریشان ہو کر بولی" ہو کچھ ہو گیا تو جی ؟"

اس کچھ کا مطلب خود بڑے سرکار بھی اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن اس سہاگ رات کا سحر جو وقت سے کچھ پہلے ہی آ چکی تھی، ابھی تک ٹوٹا نہ تھا۔ وہ اسی الھڑ پن سے بولے۔" تو کیا ہو گا ؟ ہم ایک بیٹے کے باپ بن جائیں گے۔"

باوجود پریشانی کے مہر آرا کو ہنسی آ گئی۔ لیکن یہ ہنسی جلد ہی ساتھ چھوڑ گئی۔ اسے اپنی ایک ساتھ کھیلی سہیلی کی واردات اچانک یاد آ گئی جس کا اسی کی طرح نکاح ہوا تھا۔ رخصتی ہونی باقی تھی کہ کسی نہ کسی طرح تاک جھانک میں وہ دولہا میاں کے ہتھے چڑھ گئی۔ اور خدا کا کرنا اس کا پیر بھاری ہو گیا۔ اب کون گواہی دیتا کہ یہ گناہ نہیں تھا۔ اور اسی کا بچہ تھا۔ جس کو خدا رسول کے نام کے ساتھ اس کی زندگی کا حصہ دار بنایا گیا تھا۔ مگر ایسی بدنامی ہوئی کہ پھر اس کا چاہنے والا بھی رخصت کرا کر نہ لے گیا۔ کہیں وہی حشر اس کا بھی نہ ہو ! اس نے گہرے شبہ کے ساتھ سر اٹھا کر بڑے سرکار کو دیکھا ـــ لیکن اسی لمحے اسے وہ جملہ یاد آ گیا۔" ہم تو مرد ہیں مرد ـــ اور جانتی ہو مرد آدرب کا جواب کس طرح دیا کرتے ہیں ـــ ؟"

ایک دم اس کا دل سارے وسوسوں سے پاک ہو گیا۔ جس کا مرد اتنے تیہے کا ہو اسے کیا ڈر ؟

اس کا دل نشے میں ڈوب گیا۔

دونوں باتیں ایک ہی ساتھ ہوئیں ـــ اس دن مہر آرا صبح کو اٹھی، تو

حسب معمول مونہہ دھونے حمام میں گئی، وہاں اسے اپنی آپ سے قے ہو گئی۔ متلی کے شدید جھٹکوں نے اسے بے حال کر کے رکھ دیا اور اسی دن لڑکے والوں کے یہاں سے سندیسہ آیا کہ کبھئی اب کب تک معاملہ لیت و لعل میں رکھئے گا۔ عقد کو پورے تین برس گزر چکے ہیں۔ خیر سے صاحبزادی بھی اپنی تعلیم پوری کر چکی ہیں اور اب اس سن میں آ چکی ہیں کہ ایک بیوی بہو، اور ماں کے فرائض بخوبی انجام دے سکیں۔ اس لئے اب بسم اللہ کیجئے۔

اماں بی نے بھی سوچ بچار کر بسم اللہ تو کرادی، مگر ساتھ ہی یہ بھی نیوتا بھجوا دیا کہ "ہماری اکلوتی ایک بچی ہے۔ سارے ارماناں ہم نا اس پر نکالنا ہیں۔ اس واسطے ابھی جہیز کپڑا لتا تیار کرنے کو ہم نا نیئں کچھ دو تین مہینے تو دیو۔"

جب تین سال انتظار کیا تو تین ماہ کی کیا بات تھی؟ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں عروج پر آئیں۔ عقد کے وقت کے گہنے پاتے، کپڑا سب بیکار قرار دیا گیا نئے سرے سے مہر آرا کو دولہن بننا تھا۔ اسی لئے نئے سرے سے سب جوڑ جماؤ شروع ہوا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ حیدر آباد کی تاریخ میں ایسی گہما گہمی، ایسا ہنگامہ، ایسا رکھ رکھاؤ ایسا جھم جھماکا "کسی جنگ" کے یہاں شادی میں دیکھنے میں نہ آیا۔ دلہن والوں کی حویلی جو اتنی بڑی تھی کہ کوئی دیکھنے کو اٹھتا تو حویلی کے اندر ہی اندر صبح سے دوپہر ڈھل جاتی۔ جگہ جگہ بھری تھی۔ ہر کمرہ جہیز سے اٹا پڑا تھا ـــ اس کمرے میں صرف کپڑے، اس میں زیور، اس میں برتن اس میں نوادرات، اس میں الگ اس میں دھنک - پھر یہ تھا کہ ایک کمرے میں صرف دوپٹے ہی دوپٹے ـــ کھڑے، آڑے، گوٹا لگے، کناری لگے، کرن بانکڑی ٹنکے۔ دوسرے میں کرتے

جھپا جھپ، کامدانی، کارگے، چکن، آب رواں، جاپانی ریشم، مسالے، جھکی سلمہ، ستارے کے کام والے، اسی طرح ہر ہر کمرے میں الگ الگ سجاوٹ تھی عقد تو ہوا ہوایا تھا ہی ۔ صرف یہ تھا کہ دلہن کو سجا سنوار کر مع جہیز کے سسرال وداع کرنا تھا۔

ان تین مہینوں میں مہر آرا کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ اوّل اوّل ماں بننے کا تمام حُسن اس پر واری نچھاور تھا۔ چال میں وہ دل فریبی اور مستی آ گئی تھی جو خدا نے صرف ماں بننے والی عورت ہی کے لئے رکھ دی ہے۔

دلہن بنی ہوئی مہر آرا کو دیکھنے کی خاطر سارے حیدرآباد کی بیگمات اُمڈی پڑ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ سارے سنگار ختم ہوئے۔ اور خدا خدا کر کے وہ گھڑی آئی جب مہر آرا کو بیچ کے ہال میں جانا تھا۔ مغلانی بی نے پیچھے سے جھکّا جھول پائنچے سنبھالے۔ کم خواب کا غرارہ تھا۔ اور گوٹے سے اتنا لدا پھندا تھا کہ دولہن کو سنبھالنا بار تھا۔ سہیلیوں نے بازو تھامے ۔ آہستہ آہستہ دلہن چلی ——
—— ایک قدم، دو قدم ——

اسی دم دولہا والیوں میں سے کوئی بولی "ایو یہ دلہن کیسی چل رئی کی، جیسے مہینے دو مہینے ہو کو گئے"

ایک کے مونہہ سے نکلی، دوسر کے منہ چڑھی ۔ دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی —— اور پھر تو کھلبلی سی مچ گئی —— آخر کوئی ڈھٹائی سے پکار کر بول ہی اٹھی "ایو! انے دولہن تو حمل سے ہے جی پاشا۔"

یہ وہ وقت تھا کہ مردانے سے دولہا میاں سہرا باندھے، سجے، سنورے شہزادے سے بنے۔ زنانے میں لاکر زریں دیوان پر بٹھائے ہی گئے تھے اپنی

جگر رہ بھی ٹھٹھک سے گئے۔ دلہن کی اماں بی کا کلیجہ پانی ہوا جا رہا تھا۔ حیدرآباد میں دو ایک ہی گھرانے اتنی اونچائی پر ہوں گے۔ اور ایسی بھد۔

"ایو مہر آرا —— یہ تو نے کیا کر دی گے۔؟ یہ بدنامی کا ٹیکہ کاں سے لائی گے۔۔ اب تیرے کو کون بیاہ کرے جانے والا —— یہ عمر بھر کو کیسا نکٹا کری گے

یہ بین ان کے دل سے پھوٹ رہے تھے۔ مونہہ پہ تالے پڑے ہوئے تھے سکتے کا سا عالم طاری تھا۔

دولہن والیوں میں سے کوئی کفن پھاڑ کر چیخی "کون چھنال بولی کی پاشا بیٹی ہیں —— بولنے والے ہوں گی خود۔ یہاں کے یہاں ایسا سلوک کریں تو سسرال میں لے جا کو خوب غدر کریں گے یہ لوگاں۔ ایو سنو تو ذرا بولتیں صاحب زادی امید سے ہیں ——" اس کی چیخ و پکار پر کسی نے یہ کیا کہ دائی بوا کو سامنے لا کھڑا کیا۔ ایسی شادی میہمانی کے موقعوں پر یہ تو ہوتا ہی ہے کہ ایک سرے سے پورا گھر ہی سدھیانے میں اُمڈ پڑتا ہے۔ نوکر چاکر سے لے کر ماما ئیں، مغلانیاں، دائیاں تک۔

دائی بوا تو ایسی تھیں کہ سانس سونگھ کر ہی بتا دیتیں کہ کتنے دنوں کا معاملہ ہے۔ یہاں تو پورے تین ماہ چڑھ چکے تھے۔ چہرے پر چاند چمک اٹھا تھا۔ انھوں نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے دیکھا اور بڑی بے پروائی سے کہہ دیا

"ایو مبارک نباب ساب چھ ماہ بعد سونے کے کڑے لیوں گی، اور ہاتھ بھر بھر چاندی کے چوڑیاں۔"

یہ ایسی بات تھی جس نے اماں بی کے حواس لوٹ لیے۔ پورے شہر کے لوگوں کے سامنے کیسی تھڑی تھڑی ہو رہی تھی۔ مولا بس چلتا تو اس پیٹ کی نوٹی اولاد کو کچا چپا ڈنہ کھاتیں۔ جس نے آج ناک یوں کاٹ کر رکھ دی تھی!

شیرنی کی سی گرج کے ساتھ وہ لپکیں اور ایک جھٹکے سے مہرآرا کا گھونگھٹ نوچ کر دور پھینک کر بولیں "کس کا اٹھا کر لائی یہ بیج! بول نا نکٹی!"

مہرآرا نے زرّیں دیوان پر بیٹھے بصالت جنگ کی طرف بڑی آس بھری نظروں سے دیکھا، اس کے تپتے ذہن پر یادوں کی حسین پھوار برسی — "ہم تو مرد ہیں مرد —" یہ مرد اگر اپنی زبان کھول دے اور سب کے سامنے کہدے "یہ پھل میرا ہے۔" تو وہ کس قدر سُرخ رو ہو جائے کتنی اونچی ہو جائے۔

لیکن ان معصوم نگاہوں کی تاب نہ لاکر، بصالت جنگ نے سر جھکا لیا۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے ان کی ہمّت جواب دے گئی۔ وہ کیسے بدنامی کا اتنا بڑا بوجھ اُٹھا لیتے۔؟

عین اسی وقت بھیڑ کو چیرتی ہوئی کریمن آئی اور پھولی سانسوں کے درمیان بولی "میرے کو سب معلوم ہے۔ میری پاشا بھوت بھولے ہیں۔ یہ سارے کرتوت انوں کے ہیں جو سہرا باندھ لے کو پھول سجالے کو بیٹھیں۔"

لیکن مہرآرا نے ایکدم کریمن کو اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اور بے حد حقارت سے بصالت جنگ کی طرف اشارہ کر کے بولی میرے پیٹ میں اور اس کا پھل؟ اس نامرد کا؟ یہ تو ہیجڑہ ہے ہیجڑہ —"

بھری محفل میں ہنس پڑ گئی اور بصالت جنگ کا جُھکا ہوا سر زندگی بھر کے لئے جھک کر رہ گیا۔

لڑکی بازار

حیدرآباد دکن کی ایک جگمگاتی صبح تھی۔ آفتاب ابھی کچھ جھلکا تھا۔ کچھ چھپا تھا۔ اسی دم باغ شاہی سے ایک ڈھنڈورچی، سفید گھٹنک پاجامہ، سفید ململ کا کرتا، پہنے، ترچھی ٹوپی لگائے، سلیم شاہی جوتیاں پہنے بڑی فصیح و بلیغ زبان میں ڈھنڈورا پیٹتا ہوا نکلا۔

"لڑکیوں والی ماؤں سے استدعا ہے کہ کل بروز جمعہ بعد نماز عصر، حسب سابق۔ اپنی اپنی بیٹیوں کو بہ حد امکان خصوصی لباس اور پُر تکلف آرائش و زیبائش کے ساتھ باغ شاہی میں منعقد ہونے والے مینا بازار میں لے کر موجود ہو جائیں۔ باغ شاہی میں داخلے کی کوئی رقم نہیں ہے — بگھیاں، تنگرامیں، ہاتھ رکشا، جو جو بھی بیبیوں کو لائیں گے کرایہ باغ شاہی سے وصول پائیں گے۔ اس طرح ماؤں کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ کل کی شاہی سیر انھیں بالکل مفت پڑے گی —" ٹن ٹن — ٹناٹن — ٹن ٹن

جدھر جدھر سے ڈھنڈورچی ڈھنڈورا پیٹتا گزرا ماؤں کے کلیجے دہلتے گئے۔

"کل کی شاہی سیر انھیں بالکل مفت پڑے گی۔ اس "بالکل مفت" نے ماؤں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے اُبلوا دئے۔ چلئے مان لیا باغ شاہی میں داخلے کی کوئی رقم نہ ہوگی جس بگھی یا ٹرام یا ہتھ رکشا میں آپ سوار ہو کر جائیں گی اس کا کرایہ تک حبیب یار جنگ ادا کریں گے۔ سیر سپاٹا کرنے میں جو بھی چیز آپ کو پسند آجائے گی۔ آپ مفت ہی لے بھی سکیں گی۔ لیکن اس مفت کے بدلے انھیں جو کچھ دینا ہوگا۔ وہ کوئی بھی ماں بہنی خوشی کبھی دے بھی سکی ہے؛ لیکن نئے بناچارہ بھی کیا تھا؛ یہاں سے وہاں سے ہر گھر سے گھٹی گھٹی چیخوں اور آہوں نے اس جگمگاتی صبح کو کجلا کر رکھ دیا۔

سرِشام فانوس کی روشنی سے جب نور محل جھم جھما اٹھا تو حبیب یار جنگ اپنی بڑی سی توند سنبھالے اپنی مخصوص چال سے چلتے نرم نرم دیوان پر آکر بیٹھ گئے جس پر کامدار مسند سجی ہوئی تھی۔ گاؤ تکیہ ان کی پیٹھ کے بوجھ سے بیچ سے ذرا دب کر اُبھر آیا تھا۔ سونے کا سلمہ، چاندی کے تار سے پھر رہ رہ کر جھلملانے لگے۔ خادم نے بڑے ادب سے ان کے آگے سونے کی کشتی میں نارنجی رنگ کی انگریزی شراب کی بوتل اور کٹ گلاس کے چھلکتے جام لاکر رکھے۔ (کہ حضور کا کہنا تھا کہ شراب تو بس شیشے ہی میں مزہ دیتی ہے۔ یہ بھی کوئی بادام کا حریرہ ہے کہ جسے سونے کے پیالے میں پیا جائے۔)
قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتے ہی ایک طرحدار خادمہ تلے ہوئے سرخ سرخ کبابوں کا طشت اٹھائے لچکتی بل کھاتی آئی اور اسی حرام زادگی سے مٹکتی واپس چلی گئی۔ افطار کی نیت پڑھ کر نواب صاحب نے شراب سے روزہ کھولا۔ اور تالی بجا کر ایک خادم کو طلب کیا۔ خادم تقریباً دہرا ہو کر آیا۔ اس نے نواب صاحب کو سر اٹھا کر دیکھا ہی نہیں کہ ان کے چہرے کا غیض و غضب دیکھ پاتا اس لئے جب کڑک

آواز میں نواب صاحب نے پوچھا "ہو جناب وہ مرزا صاحب کہاں مرگئیں ۔"
تو وہ یونہی کانپتا ہوا بولا ۔"دیکھتا ہوں سرکار ۔۔ اپچ گیا کی اپچ آیا ۔"
یہ نواب صاحب کے غصّے کی انتہا ہوتی تھی کہ وہ کسی نوکر کو جناب کہہ کر
مخاطب کریں ۔

مرزا صاحب بھی تقریبًا اسی انداز سے محل میں وارد ہوئے ۔ لیکن نواب صاحب کے مخاطب کرنے پر انھوں نے البتہ انھوں نے ان کے چہرے کو دیکھنے کی سعادت ضرور حاصل کی ۔

" خادم حاضر ہے ۔"

"حاضر ہے تو کیا میں چاٹوں خادم کو ؟ حضرت میں آپ کو صبح ہی بولا تھا نہ دن بھر کے روزے کے بعد شام تک میرا مزاج بہت گرم ہو جاتا ہے پر آپ کو تو کچھ یاد پچ نہیں رہتا ۔

مرزا صاحب نے جوڑے ہوئے ہاتھ سراسیمہ ہو کر ایک بار کھول کر پھر باندھ لئے ۔ وہ اب تک بھی سمجھ نہ پائے تھے کہ ان سے کیا خطا سرزد ہو گئی ہے ۔ نواب صاحب خود ہی چیخ پڑے ۔"میں آپ سے بولا تھا کہ پچھلے سال میں جتنی بھی شادیاں کیا تھا ان سبھی کو آج رات میں طلاخ دینا ہے ۔ سو آپ وہ ناماں کی فہرست تیار کرے کیا نئیں ؟"

مرزا صاحب کے دم میں دم آگیا ۔" جی بندہ پرور وہ تو میں دوپہر میں اچ پوری کر لیا ۔"

"تو وہ آپ میرے کو لاکر دیجئے ۔ میں تراویح کی نماز کے بعد سب کو بلا کر طلاخ دے دوں گا ۔"

"بہت بہتر بندہ پرور ...."

"پرنہ پرندہ ....." نواب صاحب گرجے ۔ پھر انھوں نے شراب کا ایک گھونٹ بھرا اور کچھ نرم پڑکر بولے "پر کیا ؟"

"وہ حضور چند بیگمات اُمید سے بھی ہیں ۔"

"تو اسی لئے تو طلاق دینا ہے کہ ہمیں شبہ ہے یہ بچے ہمارے نہیں ۔ بدچلن عورتوں سے کوئی کیسے نباہ کر سکتا ہے ۔ ؟ قرآن شریف میں آیا ہے کہ جب مصالحت اور معاملت کی کوئی شکل باقی نہ رہ جائے تو طلاق جائز ہے ۔"

مرزا صاحب نے دُبدھے کے ساتھ نواب صاحب پر نگاہ ڈالی ۔ مرزا صاحب تھے تو نوکر، مگر نواب صاحب کی ناک کے بال بھی تھے ۔ چونکہ معمر بھی تھے، اس لئے غصہ نیہا کرنے کے باوجود نواب صاحب ان کی عزّت کر لیا کرتے تھے ۔ اور ان کی اکثر باتیں مان بھی جایا کرتے تھے ۔ اور نہ مانتے تو کرتے بھی کیا ؟ ان کی پرائیوٹ زندگی تقریباً ان ہی کے ہاتھ میں تھی ۔

تراویح کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد نواب صاحب نے باجماعت اپنی کمسن بیویوں کو طلب کیا ۔ ننھی منّی لڑکیاں جنھوں نے کوئی اونچ نیچ نہ دیکھی تھی، جن میں سے کئی نے پاکی کا پہلا غسل بھی اسی محل میں آکر لیا تھا ۔ جن کے چہروں پر بے کسی کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں ۔ لائن سے آکر کھڑی ہوگئیں ۔ نواب صاحب نے ایسی اجنبی نظریں ان چہروں پر ڈالیں جیسے کبھی ان سے کوئی شناسائی نہ رہی ہو ۔ مرزا صاحب فہرست ہاتھ میں لئے کھڑے تھے ۔ نواب صاحب کے اشارے پر انھوں نے نام پڑھنے شروع کئے ۔

عائشہ بیگم ۔ عمر پندرہ سال

("میری نوخیز جوانی کا رس پہلے پہل آپ نے چوسا، میری اولین بہار کے پھول آپ نے چنے اور آج آپ کو طلاق دیتے ہوئے میرا نام تک یاد نہیں آتا!)

لیکن بھولے بھالے چہرے کی ایسی کوئی ان کہی تحریر نواب کی آنکھ سے نہ پڑھی گئی — انھوں نے بے حس آواز سے فرمایا — "عائشہ بیگم ہم آپ کو تین بار طلاق دے کر اپنے عقد (عقد سے باہر کرتے ہیں —" اور انھوں نے ایک کاغذان کے ہاتھوں میں پکڑا دیا اور گویا ہوئے "مگر آپ کو تا زندگی ہماری جاگیر سے دس روپے ماہانہ آپ کے نان نفقہ یعنی آپ کی گزر اوقات اور ہاں بچہ کوئی جیا بچا تو اس کی پرورش کو ملتے رہیں گے۔ حالانکہ ہم کو شک ہے کہ آپ کے بطن میں ہمارا بچہ ہے۔ اپنے اپنے ظرف اور اوخات (اوقات) کی بات ہے — ہم سے ایک سال میں کوئی بھول چوک ہوئی ہوتی تو ہم خود معافی مانگ لیتے، مگر ہم کو معلوم ہے کہ اس محل میں آپ کو کوئی دکھ نہیں پہنچا — خدا حافظ —"

سلیمہ بیگم — عمر ۱۴ سال

رئیسہ زمانی — عمر ۱۵ سال

قمر سلطانہ — عمر ۱۶ سال

پیاری بی — عمر ۱۳ سال

مبارک بیگم — زہرہ بی بی — فاطمہ بیگم — ثریا — نشاط آراء۔

—.... مرزا صاحب نام پکارتے گئے اور نواب صاحب سب کے ہاتھوں میں ان ہی بندھے تلے جملوں کے ساتھ طلاق نامے پکڑاتے گئے۔ کسی کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ نہ تھی۔ کوئی چہرہ پھول سے کم نہ تھا۔ کوئی نگاہ ایسی نہ تھی جس میں فریاد نہ ہو۔ کوئی لب ایسا نہ تھا کہ دادرسی کے لئے وا نہ ہونا چاہتا ہو۔ لیکن کسی میں اتنی

ہمت نہ تھی کہ آنکھ اُٹھا کر بات کرنے کا بھی حوصلہ ہوتا کہ یہی اس محل کا قانون تھا
تھوڑا بہت چھوڑ کر تقریباً پاؤ حیدر آباد حبیب یار جنگ کی جاگیر میں
شامل تھا — ان کی جاگیریں کوئی پیدل چلنے کو کھڑا ہوتا تو ادھر کا سورج ادھر
ہو جاتا مگر وہ سلطنت ختم نہ ہوتی ۔ ان کے بڑوں نے شاہوں کا دل جیتا تھا، اس
کے صلے میں جاگیریں اتنی بخشی گئیں، اتنی بخشی گئیں کہ پھر ان کے نام تک یاد نہ رہے
قدم قدم پہ ان کے بڑوں کی تعمیر کردہ کوٹھیاں حویلیاں اور ڈیوڑھیاں تھیں — اور
ان سے متصل نوکر خانے — پھر یہ تھا کہ جہاں جہاں ان کی حکومت بڑھتی گئی
وہ چھوٹے چھوٹے "جہان آباد" کرتے گئے ۔ حبیب یار جنگ کے دادا
حیدر آباد کے تاجدار کے ناک کے بال تھے ۔ انھوں نے، کہتے ہیں اپنا
محل تاجدار دکن کی مرضی سے ہی (چوری سے نہیں) اس طرح بھرا تھا کہ عام طور سے
ڈیوڑھیوں میں، آہنی پھاٹک سے لے کر مردانی بیٹھک تک ڈرائیو وے
کے آزو بازو جو سرخ کنکری والی بجری بچھی ہوتی ہے ۔ ہر جگہ ان کے محل میں
دو دریہ موتی مونگے، ہیرے جواہر بچھے ہوئے تھے ۔ جن کو چرا لینے کی کسی میں کیا ہمت
ہوتی کہ بری نظر ڈالنے والے کا شبہ ہوتے ہی کوڑوں سے مار مار کر بھرتا نکال لیا
جاتا —

جتنی بھی ڈیوڑھیاں، کوٹھیاں اور حویلیاں تھیں وہ سب حبیب یار
جنگ نے کرائے پر اٹھا دی تھیں ، کیونکہ دھنداڑ خالی پڑے ہوئے تھے ۔ اور کوئی
مصرف ان کا نظر نہ آتا تھا ۔ پھر یہ تھا کہ جتنے بھی کرایہ دار تھے سب انھیں جاگیر
کے ملازم ، انہی کی رعیت — جنھیں سر اٹھانے کی مہلت صرف خدا کے سامنے
تھی کہ آسمان کو دیکھیں اور اپنی بدنصیبیوں کا شکوہ کریں ۔ نواب صاحب کے روبرو

تو ان کے سر صرف جھکنا ہی جانتے تھے۔

مہتاب نے زری گوٹے سے لپا پتا جوڑا اٹھا کر دور پھینک دیا اور چلاّ کر بولی،" میں کہیں نہیں جاؤں گی امی ۔"

" نئیں جائیں گی تو ین موت مریں گی، کیا تیرے کو معلوم نہیں اس احاطے میں لینے والیوں کو اس سالانہ جلسے میں شامل ہونا پچ پڑتا ہے؟"۔

"میرے کو سب معلوم ہے، یہ بھی معلوم ہے کہ اس بازار میں جانے کا مطلب ہے اپنی زندگی کی خوشیاں اپنے آپ پر حرام کرلیو۔"

مہتاب کو ٹلہ عالی جاہ کی دہم جماعت کی ہونہار طالبہ تھی اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔

سکینہ بیگم نے رحم بھری نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا

"اتی سمجھ دار ہوکر بھی تو کیوں ایسے ناسمجھی کے باتاں کررئی تابی میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

تابی ٹھیاں تان کر چلاّئی ،" امی آپ کو معلوم نئیں کی میری شادی ہوچکی؟"

سکینہ بیگم نے اس کے مونہہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ۔" اری نیک بختی ذرا ہلو بول ،کوئی سن لیا تو نئی مصیبت کھڑی ہو جائیں گی ۔"

تابی نے زبردستی ان کا ہاتھ منہ پر سے ہٹا کر اسی ڈھٹائی سے کہا۔" اور نواب صاحب کبھی میرے کو پسند کرلئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں انھوں کے حرم میں زبردستی داخل کرلی جاؤں گی ، اور ایک بیاہتا دولہن ہوکر دوسرے کی دولہن کیسے بنوں گی ۔ ویسے آپ تو بڑے مذہبی بنتے نا امی ۔ مگر اب کیوں ہلو چپ رہ گئیں بھلا یہ کوئی مسئلہ ہے کہ دو دو مردوں کی ایکچ بیوی؟"

"مگر بیٹا میرے کو یہ بتا اپن نیئں جائیں گے تو کیا بچ سکیں گے۔ کٹنیاں تو ہر گھر کی ٹوہ لے لے کو پھرتیاں ہیں۔ کبھی نواب صاحب کو پتہ چل گیا کہ مراد میاں کی بیوہ ایسا اندھیر کرئیں کہ جوان بیٹی ہوتے ساتے مینا بازار کو نیئں لائیں تو اپن تو بن موتا مر جائیں گے۔"

"ویسے بھی یہ زندگی بڑی اچھی ہے کیا کہ دوسروں کا مونہہ دیکھ دیکھ کو بات کرو۔ میں تو آج سوچ لے کو بیٹھی ہوں کہ جاؤں نچ نیئں ۔۔"

سکینہ بیگم سخت بے زار ہو بیٹھیں۔ ان کی عقل سے ہر شے بالاتر ہو رہی تھی کوئی مصیبت سی مصیبت تھی؟ اصل قیامت تو یہ تھی کہ مہتاب جو کوٹلہ عالی جاہ کی ایک ذہین اور ہونہار طالبہ تھی اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی نڈر اور بے باک اس نے سکینہ بیگم کو پیار و محبت سے رام کر کے گذشتہ سال ہی (کہ بس ابھی اس کے چہرے کا چاند چمکا ہی تھا) چپ چپاتے اپنے خالہ زاد بھائی طاہر سے شادی رچالی تھی۔ یہ شادی عرس کے موقع پر ہوئی تھی جب اطراف کی ہڑبازی میں لوگوں کو پاس پڑوس میں تانک جھانک کا ذرا کم ہی دھیان آتا ہے۔ اور ویسے بھی اگر کسی گھر میں ایک تانگے میں لد کر چار پانچ آدمی ایک آدھ قاضی کو بٹھا کر لے آئیں تو یہ ایسی سنسنی خیز بات نہیں ہے کہ سب کی توجہ بٹ جائے۔ موٹر ہوتی تو الگ بات تھی۔ مگر شکرام اور ٹانگہ تو بڑی معمولی سی بات ہے! مہتاب تو چاہتی رہی کہ کسی طرح بلدہ چھوڑ کر بھی نکل ہی جائے۔ لیکن ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ پورے سال نواب صاحب کی مقرر کی ہوئی کٹنیاں، لڑکیوں والے گھروں کی ٹوہ لیتی پھرتی ہیں اور ایسے میں کسی کا شفٹ ہو کر جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ سفر حضر کے لئے بھی ایک مرحلہ سر کرنا پڑتا تھا۔ اور خاص طور سے ان بے کس خواتین کے لئے

جو نواب صاحب کی عمل داری میں رہتی تھیں۔ جن کے خاوند کبھی نواب صاحب کے ملازم تھے اور جو بُرے وقتوں کے ہاتھوں بیوگی کی زندگی گزار رہی ہوتیں ۔ سکینہ بیگم ان ہی میں سے ایک تھیں ۔۔ طاہر نے ایک بار یہ تجویز پیش بھی کی تھی کہ چپ چُپاتے نکل جائیں ۔ اللہ کی اتنی بڑی دنیا میں کون کسے پہچاننے چلا ہے ۔ لیکن سکینہ بیگم لرز گئی تھیں ۔ وہ جانتی تھیں کہ نواب صاحب کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ کہیں نہ کہیں سے کھوج نکلوائیں گے ۔ اور چوری چکاری کے غلط سلط الزام میں اس طرح دھنسوا دیں گے کہ ساری عمر چکی چلاتے گزر جائے گی ۔۔ وہ اپنا بڑھاپا خوار نہیں کرنا چاہتی تھیں ۔ وہ صبح سے مر مر کر مہتاب سے یہی کہہ رہی تھیں کہ بس ذرا ایک گوٹے زری کا جوڑا پہن ڈال ۔۔ بھلے سے ساج سنگار مت کر ۔ ایسی کون سی حور پری ہے کہ نواب صاحب ریجھ ہی جائیں گے ۔ سانولی سلونی صورت تو ہے ۔ ہتھیلی بھر تیل لے کر سر میں چپڑ ڈال ۔ ایسی اتری دال ایسی صورت دیکھ کر کیا آپے سے باہر ہوں گے ۔ ؟ بس ذرا راہ داری سے گزرنے تک کی تو بات ہے ۔ مینا بازار کے دن نواب اپنی گدی والی زرکار آرام کرسی عین داخلے والی راہ داری ہیں رکھواتے تھے تاکہ باغ شاہی میں داخل ہوتے ہی ہر صورت ان کے سامنے آ جائے اور انہیں فیصلے میں آسانی رہے کہ یہ شکل اس لائق ہے یا نہیں کہ اُسے زینت حرم بنایا جائے اور مہتاب کے غصے کا تو یہ عالم تھا کہ نواب صاحب کے یہاں سے بھجوایا ہوا گوٹے کناری کا جوڑا اس نے دور اٹھا کر پھینک دیا ۔ اور اس بات کو سراہنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھی کہ معلانیوں نے کس صفائی اور نفاست سے ایسے کتنے سارے جوڑے تیار کئے ہوں گے ۔ اور حساب کی ماہر طالبہ ہوتے ہوئے یہ تک جوڑنے کو تیار نہ تھی ایسے ایک جوڑے پر اندازاً کتنی لاگت آئے گی ۔

مگر جو بات ہونی تھی وہ ہو کر رہی۔ مہتاب لاکھ سانولی سلونی تھی تیل سے چپڑی ہوئی تھی۔ لیکن نواب صاحب کی آنکھ بھی ہیرے پرکھنے میں کچھ کم پارکھ نہ تھی، وہ سمجھ گئے کہ اس سانولی بدلی کے پیچھے کون سا چاند چمک رہا ہے انھوں نے تو سکینہ بیگم کو روک کر پیغام ٹھونک ہی دیا۔

دوسرے دن محل میں طلبی تھی: اسی رات طاہر میاں عید کے لئے ایک ہفتے کی چھٹی پر آئے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی دیکھا کہ گھر میں ماتم پڑا ہوا ہے۔ تابی نے پٹخ پٹخ کر اپنے کو بے حال کر لیا ہے۔ اور اماں انگ سوختہ بنی بیٹھی ہیں۔ طاہر کہ جوان خون تھا۔ اور پہلی پہلی محبت کا شدید زخمی۔ چلا کر بولا "میں اس خبیث بڈھے کو قتل کر دوں گا۔"

سکینہ بیگم نے ہول کر اس کے مونہہ پر ہاتھ رکھ دیا: "اوّو بیٹا پاس پڑوس کا تو کچھ خیال کرو۔"

"جی نہیں خالہ جان، یہ عیاشی اور ظلم کی انتہا ہے۔ میں بھی سمجھ لوں گا آج کی آخری گاڑی سے ہی تابی کو دہلی لے کر نہ چلا جاؤں تو اپنے باپ کی اولاد نہیں"

"ہو رہ بات تم بھول گئیں کہ آج نواب صاحب تابی کو پسند کر لے کو بیٹھے ہیں۔"

"یا تو نواب صاحب نہیں یا میں نہیں" — وہ جذبے میں آکر بولا

بڑے رسان سے سکینہ بیگم بولیں "میرے مونہہ میں خاک، کیا تمہارے نہیں ہونے سے یہ سلسلہ ختم ہو جائیں گا کیا؟ تم اکیلے اپنی جان سے چلے جائیں گے میاں اور کیا ہوئیں گا؟"

"مگر خالہ جان —" طاہر روہانسا ہو اٹھا — "للہ ذرا سوچئے کس قدر

ذلیل بات ہے کہ سال بھر اپنی عمل داری میں عورتیں بھجوا بھجوا کر ٹوہ لگوائی جائے کہ کون کون سے گھروں میں لڑکیاں بالغ ہو رہی ہیں اور پھر ایک بازار منعقد کروا کے لڑکیاں پسند کی جائیں۔ اور جبراً انھیں اپنے عقد میں لے لیا جائے اور پھر سال بھر بعد ان کا رس چوس کر پھوک بنا کر مذہب کے نام پر طلاق دے کر چلتا کر دیا جائے۔ اور پھر نئے نئے پھول، باغوں سے چُننے جائیں، حد ہو گئی حد!" ایک دم وہ پاگلوں کی طرح چلا اٹھا "میں تابی کو کہیں نہیں جانے دوں گا وہ میری دُلہن ہے۔"

سکینہ بیگم بڑے سکون سے بولیں۔ "ایسے چیخاں نکو مارو میاں۔ میرے اُتا حوصلہ نیئں کہ نواب صاحب سے ٹکر مول لیوں۔"

وہ جل گیا۔ "میں آپ سے ٹکر لینے کو کب کہتا ہوں؟ تابی میری بیوی ہے بھگت لوں گا۔"

تابی اس بحث کے دوران میں خاموشی سے بیٹھی رہی۔ اس کا وہ سارا طنطنہ اور تیہا مینا بازار سے واپسی پر ہی جیسے ختم سا ہو کر رہ گیا تھا طاہر کے آخری جملے پر وہ چونکی اور دھیرے سے بولی " اللہ طاہر آپ ایسے باتاں نکو کرو۔ آپ میرے واسطے کاٹے کو بھگتو۔ میں آج اپنی جان ختم کر لیتوں۔ نہ بانس رہے گا نہ بنسری بجیں گی۔"

"ارے واہ! طاہر تپے ہوئے لہجے میں بولا۔" گویا انسانی جان کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ ایسے کیسے تم اپنے آپ کو ختم کر دوگی؟ وہ جیسے سانس کی موجودگی سے بے خبر ہو گیا۔" یہ تمہارا پھول ایسا نوخیز بدن جس پر میرے بوسوں سے بھی نیل پڑ جاتے ہیں، جس نے ابھی ماستا کا خوشگوار بوجھ بھی نہیں اٹھایا۔ جس کو ابھی

میری باہوں کے شکنجے میں ٹھیک سے کسنا بھی نہیں آیا۔ وہی پھول ایسا نازک بدن اس خبیث کی آغوش میں؟ تھو تھو — میں ایک بار مل کر پہلے تو سمجھاؤں گا اور پھر.... "

وہ کہتا گیا — تابی سنتی گئی۔

عید میں تین دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ سحری کے بعد مرزا صاحب نے ذرا سونا چاہا، مگر آنکھ نہ لگ سکی، کاموں کا اک انبار ان کے سر پر سوار تھا۔ نوزمحل کی صفائی — دُہری صفائی — ایک تو کچرا جھاڑ جھنکار۔ مکڑیوں کے جالے صاف کرانا، گرد اڑوانا۔ وغیرہ، اور دوسری صفائی یوں کہ رہی سہی پرانی بیگمات کو نکلوانا — پھر نئی بیگمات کے لئے پوشاکیں سلوانا، "لاڑ بازار" کے بار بار چکر مارنا کہ نگوں کے چوڑیوں کے جوڑوں، مسّی افشاں سے لے کر مہندی، مسالوں تک کی برابری کرانا۔ پھر عود کی دھونی میں پوشاکوں کو بسانا — یہ بڑی عجیب بات تھی کہ نواب صاحب ان معاملات میں مغلانیوں تک پر اتنا بھروسہ نہ کرتے جتنا مرزا صاحب پر — وہ بھی اصل میں برسوں سے یہ فریضے انجام دیتے دیتے منجھ گئے تھے۔

صبح ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے کو تھی۔ انھوں نے اٹھ کر فجر کی نماز پڑھی اور ذرا لیٹے ہی تھے کہ دروازے پر کھٹکا ہوا — وہ ذرا حیران بھی ہوئے — اس وقت کون ان سے ملنے آیا ہوگا۔؟ پھاٹک پر چاوش نے روکا بھی نہیں آنے والا سیدھا میرے کمرے تک چلا آیا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ وقت میرے آرام کا ہوتا ہے۔ ذرا دُبدھے کے ساتھ انھوں نے دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر ایک خوبصورت تنومند جوان لڑکا کھڑا ہوا تھا وہ ذرا معذرت کے ساتھ بولا۔

" مجھے معاف کیجئے، آپ کے آرام میں مخل ہوا۔ لیکن بات ہی کچھ ایسی ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ نواب صاحب تک آپ کی بہت رسائی ہے۔ کیا آپ مجھے ان سے ملنے کا ایک موقع دلوا سکیں گے؟"

مرزا صاحب اتنی لمبی بات سے ذرا خائف ہو گئے وہ الجھ کر مگر ضبط سے بولے ۔ "میاں تم ہو کون؟ آئے کیوں؟ کام کی نوعیت بولے نہیں، میں کیسے نواب صاحب سے آپ کو ملا دیوں؟"

جی میں ایک غریب طالب علم ہوں۔ وظیفے وغیرہ کے سلسلے میں باریابی چاہتا ہوں ۔"

مرزا صاحب نے ایک دو لمحے توقف کیا، کچھ سوچا، پھر انھیں خیال آیا کہ رمضان کے پورے مہینے نواب صاحب کا ہاتھ اونچا رہتا ہے۔ روزانہ ایک طشت چاندی کے روپوں سے بھرا غرباء میں جب تک بانٹ نہیں لیتے روزہ افطار نہیں کرتے ویسے بھی ان کا فیض جاری ہی رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی ضرورت مند ہو اور اسی لئے بے وقت چلا آیا ہو کہ یہ در، خدا کے در کے بعد ایسا در ہے، جہاں سے کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں لوٹتا ۔ وہ ذرا دیر بعد بولے اچھا تم بیٹھو۔ نواب صاحب تلاوت قرآن کے بعد ہی حاجت مندوں سے ملتے ہیں مگر میرے بولنے میں کیا مضائقہ ہے۔؟"

طاہر انکسار کے ساتھ بولا ۔ "مضائقہ تو کوئی نہیں، لیکن میری آرزو تھی دیرینہ تمنا کہہ لیجئے کہ نواب صاحب کے نیاز حاصل کروں، بس اسی لئے ...."

وہ ہاتھ ملنے لگا۔

" اچھا اچھا، کوئی مضائقہ نہیں ۔" اور وہ بھاری چق اٹھا کر زنان خانے

میں چلے گئے۔

نواب صاحب نے سر سے پاؤں تک طاہر کو دیکھا اور کچھ مسکرائے۔

طاہر اپنے کالج کا بہترین اسپیکر تھا، وہ بغیر کسی جھجک کے شروع ہو گیا "مجھے حضور سے ملنے کی بہت تمنا تھی" وہ کچھ مسکرایا۔ "اور مجھے اس کا یقین تو کیا گمان تک نہ تھا کہ میں کبھی آپ سے مل بھی پاؤں گا۔ آپ کی سخاوت کے قصے بے حد سُنے ہیں ....."

نواب صاحب ذرا ناگواری سے بولے ۔"میاں لڑکے جو کچھ تم کو مانگنا ہے مانگ ڈالو، ہمارے آرام کا وقت ہے۔"

"حضور، سرکار —" طاہر لجاجت سے کورے لہجے میں بولا:

"بس ایک ہی مانگ ہے کہ آپ مہتاب کو میرے حق میں چھوڑ دیں۔ وہ میری منکوحہ ہے۔"

نواب صاحب سناٹے میں آ گئے — دنیا کے کسی قانون میں کوئی دفعہ ایسی نہ تھی جو وہ یہ سوال بھی کر سکتے کہ کس کی اجازت سے تم نے مہتاب سے شادی کی — کافی دیر بعد انھوں نے ایک ہی سوال کیا۔ "تمہیں معلوم ہے لڑکی بالغ نہ ہو تو شادی، ہمارا مطلب ہے کہ نکاح فاسد ہو جاتا ہے؟"

"لیکن تابی نابالغ تو نہیں تھی، جب میں نے اس سے شادی کی۔"

انگاروں جیسی آنکھوں سے انھوں نے طاہر کو گھورا — بہت لمبے ہاتھ ہیں میاں تمہارے؟"

تھوڑی دیر بعد وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولے ۔" اچھا ہم بعد میں سوچ کے کو بولیں گے۔ ابھی تو تم ہمارا ایک کام کر دیو — یہ گھڑی ذرا برابر

نہیں چل رہی - چوک کے پاس جو گھڑی ساز کی ایک بڑی سی دکان ہے وہاں بنانے
کو دے دیو - پر دیکھو سنبھال کو لے جانا، اس کی چین اصلی ہیروں کی ہے —" اور
انھوں نے گھڑی طاہر کے ہاتھ میں تھما دی -

لمبی سی راہ داری سے ہوتے ہوئے طاہر ابھی محل کے پھاٹک تک بھی نہ پہنچا
ہوگا کہ کئی مضبوط ہاتھوں نے اسے بُری طرح جکڑ لیا - اس نے ہڑبڑا کر اوپر دیکھا
چار، چھ سیڑھیاں اوپر نواب صاحب اور مرزا صاحب کھڑے تھے -

نواب صاحب نے مسکرا کر مرزا صاحب سے کہا، " امین صاحب
(پولیس) سے بولو بے چارہ روز ے سے ہو بئیں گا . ارییٹ کی ضرورت نہیں
بس "چار دیواری" کافی ہے -"

مرزا صاحب گرج کر بولے " مگر حضور ہیروں پر ہاتھ صاف کرنا کوئی معمولی
جرم ہے ؟ اور وہ بھی حضور کی خاندانی گھڑی -"

مگر جب تک حضور پلٹ کر جا چکے تھے -

مہتاب نے نکاح کے رجسٹر پہ دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا
نواب صاحب مذہبی معاملوں میں جور، جبر اور زیادتی کے قائل نہ تھے وہ ریان
سے مرزا صاحب سے بولے " لڑکی کی رضا کے بغیر نکاح کیسے ہو سکتا ہے ؟ یہ
لڑکی ہم کو بہت پسند آگئی ہے - اس واسطے آپ ایسا کرو کہ اس کو چند روز کے
واسطے پھر پورا عیش فراہم کرو کہ وہ روپے پیسے کی ریل پیل دیکھ کر راضی ہو جائے -

" پر حضور —— آپ سُنے نہیں . وہ تو چلا چلا کر یہ بھی کہہ رہی تھی کہ میں
شادی شدہ ہوں — میری شادی ہو چکی ہے - اور حضور پہلا شوہر ہوتے ہوئے

دوسرا نکاح تو خطعاً (قطعاً) ناجائز ہے۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ محض ایک چال ہے۔ بہرحال آپ دخت کا انتظار کرو ___"

دوسرے دن نواب صاحب کو یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ تابی کو زیر کرنے کے لئے جس عیش کے فراہم کرنے کے بارے میں مرزا صاحب کو ہدایات دی گئی تھیں، بے سود رہا۔ مرغن کھانوں کو تو اس نے دھڑا دھڑ اٹھا کر پھینک دیا اور بھاری زرتار ریشمی پوشاک کو پھاڑ پھوڑ کر اس نے دھجیاں بکھیر دیں اور اب ننگی بیٹھی ہوئی ہے۔"

"ننگی!" نواب صاحب نے ہونٹوں پہ زبان پھیری ___ مگر روزے کا لحاظ کر کے سنبھل گئے۔

"کوئی بات نہیں ___ اس سے پہلے دو ایک خودسر چھوکریاں اور بھی ایسے تماشے کر لے کو ہم کو حیران کئے تھے۔ پر دخت سب کو سنبھال لیتا ہے۔"

عید کا چاند چمکا۔ مسجدوں میں منادی ہو گئی کہ کل عید ہے۔ آج سے تراویح موقوف کی جاتی ہے۔ نور محل میں چاندنی چمک چمک اٹھی ایک ایک گوشہ بقعۂ نور بننے لگا۔ عشاء کی نماز کے بعد ابھی نواب صاحب لیٹے ہی تھے کہ مرزا صاحب ہاتھ جوڑتے ہوئے آئے۔

" حضور، وہ گھوڑی چور ___" نواب صاحب نے ہمت بندھائی

"وہ تو مر گیا!"

"مر گیا ___؟" نواب صاحب ذرا حیرت سے بولے "اتنا دبو نکلا کہ

چار کوڑوں کی مار سے مرگیا ۔ ؟"

"جی نہیں سرکار ـــ وہ اوپری کھڑکی کے سلاخاں پتہ نہیں کیا کرکے توڑا اور نکل کر کودنے جارہا تھا کہ غلطی سے ایسا ہو ندسے (اوندھے) مونہہ گرا کہ دھینچ دم نکل گیا، اس کا ـــ کھڑکی بہت اونچی تھی نا سرکار!

نواب صاحب اطمینان سے لیٹ گئے ۔ "تو اس میں ہمارا تو کوئی خصور (قصور) ہی نہیں ۔ اپنی موت مرا، ہماری گردن پر تو خون ناحق نہیں نا!"

"جی نہیں سرکار ـــ بھلا آپ کا کیا خصور ـــ میں تو خالی حضور کو اطلاع دینے حاضر ہوا تھا ـــ ایک کانٹا آپی آپ نکل گیا۔ اگر واقعی وہ مہتاب بیگم کا شوہر تھا تو بھی اب تو خصہ (قصہ) ہی ختم ہو گیا۔

"بس اللہ ہم پر مہربان ہے ۔"

دوسرے دن عید تھی، نواب صاحب نماز عید کے لئے عیدگاہ روانہ ہونے ہی والے تھے۔ ایک پاؤں بگھی کے پائیدان پر تھا اور ایک زمین پر، کہ اندر سے مرزا صاحب سراسیمہ سے وارد ہوئے

"حضور غضب ہو گیا ـــ " مہتاب بیگم بھی انتقال فرما گئیں ـــ "

نواب صاحب ایک لمحے کو سراسیمہ سے ہو گئے ـــ وہ کیسے ۔ ؟"

حضور، اُنھوں کے ہاتھوں میں جو کانچ کی چوڑیاں تھے نا اس پر کسی کا دھیان نہیں گیا۔ وہ اتوں پیس کر کھا ڈالے ۔"

نواب صاحب نے بگھی میں بیٹھ کر اطمینان اور سکون کے ساتھ دونوں ہاتھ اللہ کے حضور میں اُٹھا دیئے ۔

"میں خجیر (حقیر) بندہ کس زبان سے تیرا شکر ادا کروں خدا کی تو نے

مجھے گناہ میں نہیں ڈالا۔ ورنہ حشر کے دن میری گردن پر خونی ہونے کا جارکھا
جاتا۔"

پھر وہ مرزا صاحب سے بولے۔ "کم بخت مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے
ہیں اور مذہب سے یہ لاعلمی! معلوم نہیں کہ خودکشی کتنا مذموم فعل ہے۔ جس کی
اللہ کے پاس کوئی معافی اِرج نہیں ہے۔"

سامنے ایک خدمتگار، چاندی کے طشت میں سونے کی اشرفیاں لئے
کھڑا تھا کہ ہر عید کو حضور کا دستور تھا کہ جب تک غریبوں کو خیرات نہ بٹ
جاتی وہ کہتے عبادت قبول نہیں ہوتی ان کے طشت کو ہاتھ لگاتے ہی کوچ
بان نے سونٹا ہوا میں لہرایا اور سکوں کی برسات میں دعاؤں میں شرابور
نواب صاحب کی بگھی عیدگاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

شادی

"بی بی - پانی نہالیو - میں حمام تیار کر دی -"

صندل نے دبے پاؤں آکر جہاں بانو کو اطلاع دی - مگر جہاں بانو اس وقت چھپر کھٹ پر اوندھی لیٹی مزے مزے میں ٹانگیں ہلا ہلا کر کوئی چٹ پٹا سا ناول پڑھ رہی تھی - صندل کی بات جیسے اس کے کانوں میں پڑی ہی نہیں -

جب صندل نے دوبارہ کہا "بی بی پانی ٹھنڈا ہو جائیں گا -" تو جہاں بانو اٹھ کر بیٹھ گئی - ایک ہاتھ سے کتاب دور پھینکتی، دوسرے ہاتھ سے صندل کو اپنے بستر میں گھسیٹتی بولی "اللہ صندل تیرے کو نبی کا واسطہ - میرے کو روز روز یہ مصیبت میں مت ڈالا کر، -"

صندل دید سے پھاڑ کر بولی "بی بی پانی نہانا مصیبت ہے -"

"صندل" وہ کھلکھلائی "آج میرا دل نہلنے کو بالکل نئیں چاہ را۔ میرے بدلے تو اُبٹن مل کو موگرے ملے پانی سے نہالے۔"

"ہور نہا کو ؟" صندل مسکرائی۔

"نہاکو آج تو اپنی سیج سجالے۔"

"کمرہ جوان ہنسیوں سے کھبر کھبر گیا۔

نکو نکو۔ میرے کو معاف کردیو۔ صندل ہنستی شرماتی ہوئی بولی

"یہ نہالنے دھونے آپ کو اِچ مبارک۔

سارا سلسلہ یہ تھا کہ جہاں بانو، جس کی شادی کو ــــ سال بھر سے بھی زیادہ ہو چکا تھا۔ جب بھی میکے آتی : "مما جانی" اس کے وہی چاؤ چونچلے کرتیں ۔ جو نئی دلہن بننے والی لڑکیوں کے ہوتے ہیں کہ رات ہی سے سر دھونے کے لئے مسالہ بھگویا جا رہا ہے۔ شیکا کائی اُبل رہی ہے۔ جسم دھونے کے لئے ابٹن چکسے کی تیاری کا حکم صادر کیا جا رہا ہے۔ دامادوں کو خوش ایک طریقہ یہ بھی تو ہے کہ بیٹیوں کو خوشبوؤں میں مہکا کر، عطر پھلیل میں بسا کر پیش کیا جائے ــــ اس خدمت پر ہمیشہ صندل مامور کی جاتی۔ کہ وہی بچپنے سے جہاں بانو کی دل لگی سہیلی تھی ۔ جہاں بانو سے اس کی خوب پٹتی تھی اور خود اسے بھی ان بی بی کا کام کرنے میں بہت مزہ آتا، ــ جہاں بانو تو اسے سسرال بھی ساتھ ہی لے جانا چاہتی تھی، مگر مما جانی نے سوچا کہ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے اپنے ہاتھوں بیٹی پر سوکن بٹھا دی۔ ویسے جب بھی جہاں بانو آتی وہی اس کی پیشوائی اور پیش خدمتی کو حاضر رہتی ــ دونوں مالکن اور نوکرانی کم، سہیلیاں زیادہ لگتیں۔ اسی مارے نوکروں کی پلٹن جلن سے مرجاتی تھی ۔

نگے صندل — جانو کو نہلا دی کہ نہیں ؟" پرے صحن سے بڑی بیگم کی قریب آتی آواز سے ہوا کر صندل نے کمرے کا دروازہ دھڑ سے بند کر لیا
"ایو بی بی — خدا کے واسطے جلدی سے گھس کو حمام کا دروازہ بند کر یو جی ۔ نہیں تو بڑی پاشا میرے کو کناڑ چین گے کی برلا ہوا کام بھی نہیں کرتی"
"اللہ یہ بھی کوئی زبردستی ہے جی ۔ کیا روز روز نہانا فرض ہے ۔ ؟ جا بول دے میرے کو بخار ہے ۔ میں نہیں نہاتی ۔ ۔
" وہ مار بھی میرے اوپر اچ پڑیں گی نا ۔ بڑی پاشا بولیں گے نہیں کہ جب معلوم تھا کی بچی کو بخار ہے تو مسالے ابٹنے کائے کو بھگائی ، ہور میں تو ابٹن میں عطر بھی ملا کو رکھ دی ہوں ۔ سب نخصان (نقصان) ہو گیا نا ۔ ؟"
کتے وضدیل باتاں کرئی صندل تو — جب اتنا ڈر ہے تو تو خود نہالے میں بول دیوں کی میں نے نہالی ۔ تیری بھی بات رہ جائیں گی ۔ میری بھی —"
اور جہاں بانو نے صندل کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور اٹیچڈ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا ۔

تھوڑی دیر تک نوجہاں بانو ناول پڑھتی رہی پھر چپکے سے اٹھ کر باہر والے میدان کی طرف ہولی ۔ جہاں اس کے میاں اور اس کے بھائی دونوں ہی بچوں میں بچہ بنے ، گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے ۔

صندل نے عطر ملے ابٹن سے اپنے جسم کو کیا ملا کہ جیسے انگ انگ کو ڈینے لگا ۔ زعفران اور ہلدی والے چکیسے سے جلد کی رنگت سونا بن کر دمکنے لگی ۔ سونا چاندی لنڈھاتے جسم پر آگے پیچھے بالوں کی لٹیں موتی برسانے لگیں ۔ اپنی ،

خوشبوؤں سے آپ مست ہونے والی ہرنی کی طرح اس نے کھونٹی کی طرف اپنا سونے کا ہاتھ بڑھایا۔ ایکدم اس کو گھن سی آئی ۔ اِتنے عطر مسالے چکسے سے نہاکو پھر وہی کے وہی کپڑے پہن لیوں ؟ چھی !" اصل میں جہاں بانو نے اسے ایسی جلدی میں غسل خانے میں ڈھکیلا تھا۔ کہ اسے واپس جاکر کپڑے لانے کی بھی سدھ نہیں رہی تھی ۔ اب نہانے کے بعد خیال آیا تو کیا آیا ؟۔ اس کی کوٹھری تو کافی دور تھی۔ "چلو یہ دوپٹہ اوڑھ اوڑھ کو چلی چلوں ۔"۔ ویسے بھی اس وقت زنان خانے میں آنے والا کون تھا۔ ؟

ہاتھ کا رنگا گلابی ململ کا دوپٹہ جو اس نے ابھی ابھی اتارا تھا۔ سارے بدن پر لپیٹ لیا۔ گیلے بدن سے لگتے ہی دوپٹہ یوں چپک گیا۔ مانو کسی نے گوندھ سے مڑھ دیا ہو ۔ گلابی ململ نے بدن سے لپٹ کر جیسے اسے شراب کی جھلجھلاتی بوتل بنا دیا۔ دروازے کے پاس جڑے ہوئے قدآدم آئینے میں اس نے اچٹتی نظروں سے اپنے سراپے کا جائزہ لیا تو اسے چکر سا آگیا

جکراتی ، ڈولتی ، اپنے آپ کو سنبھالتی جب وہ حمام سے نکل کر جہاں بانو کے کمرے میں آئی تو کلیجہ دھڑ سے اُڑکر جیسے حلق میں آٹکا ۔

اندر سے چٹخنی لگائے ، دروازے سے پیٹھ ٹکائے یوسف پاشا کھڑے تھے ! ہر چند کہ یوسف پاشا بے حد شریف قسم کے آدمی تھے ۔ نوربانو جہاں بانو، کے بڑے بھائی ہونے کے ناطے اس کے ساتھ بھی ہمیشہ بڑا مشفقانہ برتاؤ رکھتے تھے ، کبھی کبھی جب نوربانو اور جہاں بانو کے لئے تحفے لاتے یا عیدوں پر چھوٹوں کو عیدی دیتے تو اس کے ہاتھ میں بھی عیدی ضرور تھما دیتے ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے یہ کب کہا تھا کہ میں مرد نہیں ہوں۔

یوں آگ اُگلتی جوانی سامنے دیکھ کر وہ بری طرح سٹپٹا گئے ۔ ہڑبڑا کر بولے "میں گلی ڈنڈے میں ہار گیا تھا ۔ داؤں دینا جان پر آیا تو یہاں آکے چھپ گیا ۔ میرے کو معلوم نہیں تھا ..... ۔ وہ الفاظ ڈھونڈتے رہ گئے ۔ صندل کے دونوں ہاتھ یکبارگی اٹھے کہ کچھ چھپا لیں ۔ لیکن چھپا لینے کی کوشش میں وہ تو مجسّم دعوت بن گئی ۔ ویسے بھی موئی ململ کی اوقات ہی کیا ؟

یوسف میاں نے آج تک شراب نہیں چکھی تھی ۔ بس کالج سے حویلی ۔ حویلی سے کالج ۔ بہت ہوا تو اپنے یار دوستوں میں بیٹھ کر، کمرے کا دروازہ بند کر کے، "بابا حضور" کی نگاہوں سے بچ کر تاش کے پتے کھیل لئے ۔ لیکن آج انھیں اچانک احساس ہوا کہ شراب کا ذائقہ زبان اور ہونٹوں سے نہیں آنکھوں سے بھی چکھا جاتا ہے ۔ آج سے پہلے بھی ایک بار صندل نے ایسے ہی گیلے بدن کی آنچ سے انھیں جلانے کی کوشش کی تھی ۔ ہوا یہ تھا کہ وہ بیچارے اپنے دھن میں ناک نیچی کئے سیدھے زنان خانے میں چلے گئے ۔ وہاں چھوٹے کمرے میں صندل اپنی شلوار کے پائینچے گھٹنوں تک اوپر چڑھائے شیشے کی پنڈلیوں پر کسی بی بی کے ننھے بچے کو لٹائے پیرس سوپ سے نہلا رہی تھی ۔ بچہ تو نہلایا ہی جا رہا تھا ۔ خود صندل بھی بھیگ کر چڑیا بن گئی تھی ۔ دوپٹہ اتار کر اس نے الگ پلنگڑی پر ڈال رکھا تھا ۔ پائینچے تو تھے ہی گھٹنوں سے اوپر جھک کر نہلاتے میں کالے کرتے کی بٹن پٹی سے چاند سورج الگ جھلکے پڑ رہے تھے ۔ کیا چھپا تھا اور کیا ڈھکا تھا ۔ یہ تو وہی جانے جس نے تاک جھانک کی ہو ۔ جلے پاؤں کی بلی کی طرح وہ وہاں کٹھہرے ہی کب تھے کئی دن تک پیرس سوپ کی جان لیوا خوشبو ان کے حواس پر چھائی رہی ۔

پڑھنے بیٹھتے تو کتابیں پیرس سوپ بن جاتیں لکھنے بیٹھتے تو قلم پیرس سوپ بن جاتا — ساری دنیا کی خوشبوئیں جیسے ایک پیرس سوپ کی خوشبو پر نثار تھیں ۔ بڑی مشکلوں سے کالج میں پڑھنے لکھنے میں جی لگایا۔

لیکن آج — ؟

پیرس سوپ کی وہ جان لیوا مہک مجسّم ان کے سامنے کھڑی تھی، بال بال سے قطرہ قطرہ ٹپکتا خوشبودار پانی ۔ چمکتے کانچ اور شیشے کو مات دینے والی کھلی پنڈلیاں ۔ رگڑ رگڑ کر نہلایا ہوا گلابی دہکتا دمکتا جسم۔ ململ کے ایک حقیر سے گلابی دوپٹے نے کس کر سمیٹ رکھا تھا۔ اور پھر انگاروں کی طرح دہکتے سرخ ہونٹ —!

یہ اپنی جگہ سہمی ہوئی — وہ اپنی جگہ ہمّت کرتے ہوئے پتہ نہیں کتنی دیر یوں ہی گزر گئی ۔ تپتے ہوئے جسم کی حدت سے ململ کا دوپٹہ یہاں وہاں سے سوکھنے لگا — گلابیاں نکھرنے اور مزید پاگل کرنے پر کمربستہ ہوگئیں ۔ سانولے رنگ میں کیا خاص بات ہے، بہتوں کا ہوتا ہے — مگر، اس کمبخت کے سانولے پن میں جو دمک ہے، جیسے جسم میں کسی نے سونا پگھلا کر اندر بھر دیا ہو — وہ دمک رہ رہ کر بے قابو ہو جانے پر ابھارتی ہے — یوسف میاں حواس ہوتے ہوئے بھی پاگلوں کی طرح جھپٹے — صندل کو دونوں ہاتھوں پر پھولوں کی طرح سنبھال کر چھپر کھٹ پہ لا کر یوں رکھا جیسے نو بیاہی دلہن ہو —

" صندل ، . . . . . صندل . . . . " مدھم اندھیرے والے کمرے میں ان کی ڈوبی، ڈوبی آواز ابھری —" میں تمہارے ان بالوں میں جن سے قطرہ قطرہ

پانی ٹپک رہا ہے ایک ایک میں سچا موتی پرو دیوں گا۔ میں تم پر سے قربان ہو جاؤں گا۔ صندل آج کے بعد کبھی تم کو الگ نہیں کروں گا۔ میں سچی بولتا ہوں صندل میں تم سے شادی کریوں گا۔"

صندل کچھ نہ بولی۔ بولتی کیا؟ یہ وقت تو حویلی میں پلنے والی ہر لڑکی ہر نوکر لڑکی، ہر ملازمہ پر آتا ہی تھا۔ یوسف پاشا نہ ہوتے، کوئی اور ہوتا۔ بکریوں کے گلے میں سے کوئی نہ کوئی بکری کسی نہ کسی بھیڑیئے کا نوالہ بنتی ہی۔ لیکن اس کے کانوں میں جیسے رس سا ٹپک رہا تھا۔ "میں سچی بولتا ہوں صندل میں تم سے شادی کریوں گا۔" (کم سے کم یہ الفاظ تو آج تک کسی اور خادمہ کے کانوں کا مقدر نہیں بنے تھے)

لمبے چوڑے چھپر کھٹ پر حیدرآبادی نگوں کے جوڑے کا ایک۔۔۔ گوٹ ٹوٹ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ یوسف میاں نے ٹوٹے ہوئے گوٹے کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنی جیب میں رکھا، مڑی تڑی صندل کی ٹھوڑی اٹھا کر بڑے پیار سے بولے "آج کے پیارے دن کی یادگار۔۔۔ یہ ٹوٹی ہوئی چوڑی۔۔۔ اس کو میں سدا اپنے دل کے پاس والے جیب میں رکھوں گا۔"

انھوں نے پہلے تو ذرا سا دروازہ کھول کر جھری سی بنا کر دیکھا کہ کوئی ہے تو نہیں۔ جب میدان صاف پایا تو ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے۔۔۔ اور صندل کی زندگی سے نکل گئے۔

تھے تو یوسف میاں بھائی بہنوں میں سب سے بڑے۔ لیکن شادی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ بابا حضور نے بیٹیوں کا دونوں کا بیاہ کر دیا تھا۔۔۔ لڑکیوں کو پڑھ لکھ کر کون سی نوکریاں کرنی تھیں۔ مگر لڑکوں کی تعلیم تو پوری ہونی

ہی چاہیئے۔ اسی لئے انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ جب تک یوسف پاشا بی اے نہ کرلیں، شادی کی بات سوچیں گے بھی نہیں۔ منگنی ونگنی کے وہ قائل نہیں تھے خواہ مخواہ اٹکا کے چھوڑ دینا انہیں سخت ناپسند تھا۔ لڑکے لڑکیوں کا کال نہیں پڑا تھا۔ بس انسان ارادہ کرے۔ ایک چھوڑ ہزار موجود ہیں۔ بیٹیوں کے کے بھی انہوں نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ کئے تھے۔ حالانکہ بڑی بیگم ہاں، ہاں کرتی ہی رہ گئی تھیں کہ "اتنی جلدی پیغام آیا بھی قبول بھی کر لیئے۔ نہ دیکھے نہ بھالے۔ مولا معلوم کیسے لوگاں ہیئں۔ کیا ہیئں۔" مگر بابا حضور سنتے سب کی تھے، کرتے دل کی۔

اور اب یوسف میاں کا بی اے کا نتیجہ آتے ہی انھوں نے ان کے لئے بھی رشتہ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ سلامت یار جنگ کی بیٹی ان کی بچپن کی دیکھی بھالی تھی۔ اللہ جانے اس گھرانے پر کیا اللہ کی مار تھی کہ ایک بھی شکل ڈھنگ کی نہ تھی۔ نوابوں کا گھرانا تھا مگر صورتیں دیکھو تو چماروں کی۔ لیکن ان کی سب سے چھوٹی بیٹی زلیخا جیسے راستہ بھول کر اس گھر میں آ نکلی تھی۔ چاند سا ماتھا۔ کمر تک لٹکتے ہوئے چھوٹے ہی سہی، مگر خوب گھنے بال۔ کنجوں کی طرح سبز آنکھیں، دودھ سے دھلی رنگت، — اور قد و قامت اس قدر موزوں اور سبک کہ خدا ہی ایسی مورتی گھڑ سکتا تھا — انگلش اردو سب پڑھی لکھی تھی، اور پھر یہ کہ لاکھ بابا حضور حیدرآباد بھر میں اعتماد الدولہ شمار ہوتے تھے، اور اشرفیوں پر چلتے تھے۔ مگر آتا ہوا پیسہ بھی کسی کو برا لگتا ہے؟ سنا گیا تھا کہ ایک ایک بیٹی کے نام سلامت یار جنگ نے دو دو لاکھ روپے نقد نقدی جمع کر دی ہے۔ اور اوپر سے داماد دں کے گھوڑے جوڑے الگ۔ دان

دہیز، زیور، کپڑا، لتا جیدا، مماجانی کا سر نہیں پھرا تھا کہ وہ خواہ مخواہ بڑے نواب کی رائے رد کرتیں۔ جب سبھی کچھ برابر تھا تو بھلا شادی میں دیر کیوں ہوتی ۔؟ حویلی میں وہ آپا اُتر رہی ہیں، یہ خالہ جارہی ہیں۔ رشتے ناطے کی ممانیاں، تائیاں چچیاں سب جمع ہونے لگیں۔ بڑے تام جھام سے پیام لے جایا گیا ۔ سلامت یار جنگ جیسے سوچے ہی بیٹھے تھے کہ کب پیام آتا ہے اور قبول کرتے ہیں ـــ ہاں کا جواب ملتے ہی شادی کی تیاریاں شباب پر آ گئیں۔

اتنے سارے دنوں میں پھر کبھی یوسف پاشا جا کر زنان خانے میں جھانکے نہ صندل سے ان کی ملاقات ہی ہوئی اور سچ تو یہ ہے کہ کبھی ان کو خیال نہ آیا کہ کوئی ان کے ایک وعدے پر اپنی زندگی تک ھار بیٹھا تھا ۔ وہ تو اس واقعہ کو اس طرح بھول گئے تھے جیسے کوئی بے حد شدید بھوک میں ڈٹ کر کھانا کھالے ، اور سیر ہو جائے

اب مہینوں گزر جانے پر یہ کب یاد رہتا ہے کہ کبھی کب بھوک لگی تھی اور کیا کھایا تھا مرد تو وہی جو کھائے پیئے اور بھول جائے ـــ لیکن ادھر صندل، جیسے ساری دنیا سے ٹکر لینے کو تیار بیٹھی تھی ـــ پیاموں کی اس کے لئے کمی کب تھی ـــ تھی تو وہ حویلی کی پالکڑی چھوکری مگر پچھلے اچھوں نے مماجانی کے پاس اس کے لئے پیغام بھجوائے تھے ـــ جوانی کو تپ چڑھے ڈالو وہ تو بندریا پہ بھی آتی ہے تو اسے سندر بنا دیتی ہے ۔ صندل کی تو تھی ہی قاتل جوانی ـــ مگر نوکرانی ہونے کے باوجود ان کا جو رکھ رکھاؤ، جو سلیقہ اور جو دل بیت لینے والے انداز تھے ۔ وہ اسے بیگموں میں بٹھانے کے قابل بناتے تھے ـــ بابا حضور کی بیٹیوں کے سلیقے، ماسٹروں اور استانیوں سے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سیکھا ۔ وہ الگ ۔ پھر سارا جہاں بانو نور بانو کی اُترن پہنی

جو برائے نام ہی اُترن ہوتی۔ ایک سے ایک عمدہ ریشمی جوڑے، غرارے شلواریں۔ تنگ پاجامے، کھڑے گلے کے کرتے، نیچے گلے کی کرتیاں۔ فیشن تو ان بہنوں پر ٹوٹ کر سوار رہتا تھا۔ اور ان سب کی حصّہ دار صندل بھی بنتی۔ ایسے میں اس کا حسن اور بھی گمراہ کر دیتا۔ مما جانی کی ایک رشتے کی بہن نے تو اس کے لئے باقاعدہ پیام بھی بھجوا دیا تھا۔ ان کے بیٹے کسی عید پر سلام کرنے خالہ کے یہاں آئے تو سینی میں سوئیاں اور شیر خورمہ لئے، مخلئ لباس پہنے۔ جھوٹے موتیوں کے زیور سے سجی سجائی صندل ہی سامنے آئی۔ یہ تو ایسے ہوش بھول بیٹھے کہ پوچھئے نہیں۔ ماں کو ٹھیل ٹھیل کر پیام بھجوا کر ہی دم لیا۔ مگر مما جانی نے ایک مونہہ لاکھ بول سنا کر چھوڑے۔ بابا حضور ہنس ہنس کر کہتے رہتے۔ ۔" اجی بیگم صاحبہ غریبی کوئی عیب تو ہے نہیں جو آپ ایک اچھے خاصے ہوتے رشتے کو توڑ دے رہیں"۔ لیکن ایسے موقعوں تو بابا حضور کی بھی ایک نہ چلتی۔

ان سب سے ہٹ کر بابا حضور کے خاص منشی جی کے بیٹے مراد کا تو یہ حال تھا کہ آتے جاتے صندل کے داری بھیرے جاتا۔ اس نے تو جیسے ٹھنۃ ہی کر رکھا تھا کہ شادی کروں تو صندل سے، نہیں تو جان ہی دے دوں گا۔" صندل اس کی محبّت کو ہنس بول کر برداشت کرتی رہتی تھی۔ لیکن ادھر جب سے یوسف پاشا اسے کلی سے پھول بنا گئے تھے وہ انھیں کے گلے کا ہار بن کر جینے پر تل گئی تھی۔ اتنے بے شمار دنوں میں بس ایک بار دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ صندل عصر کی نماز پڑھ کر جائے نماز تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔ ابھی سفید دوپٹہ معصوم چہرے کے گرد بندھا ہی ہوا تھا۔ جیسے سارے آسمانوں کا نور اسی ایک چہرے پر اُتر آیا تھا۔ اسی دم باہر سے مارچیخوں پر چیخیں سنائی دینے لگیں۔ یوسف

میاں ہر نوکر اور نوکرانی کا نام لے کر پکار رہے تھے ۔ بھاگتے دوڑتے بہت سارے لوگ ان کے کمرے میں پہنچے تو پتہ چلا کہ ان کی جھک جھکاتی نئی سلکن قمیص پر سیاہی اوندھ گئی ہے۔ اور وہ ایک ایک سے داغ دور کرنے کی ترکیب پوچھ رہے ہیں ۔ مراد نے ان کو چونا ملنے کو کہا اور خود ہنسی روکتا باہر نکل گیا اس کے پیچھے باقی لوگ بھی چل دیئے ۔ بس وہ کھڑی رہ گئی ۔ جی چاہا پوچھے ۔" ایک نامراد قمیص پر ذرا سا سیاہی کا چھینٹا پڑ گیا تو اس کے داغ دھو رہے ہو نواب ۔ لیکن جو میری چاندنی جیسی زندگی کو داغ داغ کر دیا ہے تو اُسے کون سے چونے سے دھوئے گے ۔ ؟" لیکن وہ بولی کچھ نہیں ۔ یوں ہی بیچارگی کی تصویر بنی کھڑی رہی ۔ اچانک یوسف میاں نے پلٹ کر دیکھا ۔ اللہ اللہ کس قدر انجان نگاہیں تھیں ! کہاں تو صندل سوچ رہی تھی کہ اسے دیکھتے ہی یوسف پاشا کو کچھ نہ کچھ تو یاد آئے گا۔ انگاروں کی طرح دہکے ہوئے ہونٹوں کا کوئی بھولا بسرا بوسہ ، گیلے بدن کی کوئی لَو ۔ اور کچھ نہیں تو حیدرآبادی نگوں والے گوٹ کا ٹوٹا ٹکڑا ہی ۔ لیکن انھوں نے کہا تو صرف اتنا کہا " ارے تو اتی دبلی کائے سے ہوگئی ۔ ؟"

اس طرح بس دو ہی سبق میں پیار کا پورا ڈرامہ ہی ختم ہو گیا۔ اور اب تو حویلی میں وہ دھوم دھڑکا تھی کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی ۔ پہلے تو خود حویلی ہی اتنی بڑی کہ زور لگا کر چیخو تو ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک آواز نہ جائے۔ اور اب تو شادی کی چیخ دیکار مچ رہی تھی، تنگ آکر حما جانی نے دالان میں نوکروں کو بلانے کے لئے ایک گھنٹہ ٹنگوا دیا۔

ایسے شور شرابے میں صندل کی سسکیاں کون سنتا ؟ ۔

جتنا بڑا گھرانہ تھا، اتنا ہی بڑا اسمد ھیانہ بھی ملا - زلیخا بیگم، کے دولہا میاں کو ایک نہ دو پورے پانچ لاکھ کل دار روپیے جوڑے گھوڑے کے ملنا طے پائے بیٹی کا جہیز الگ رہا۔ داماد بیٹی کے لئے ایک خوبصورت سجی سجائی کوٹھی الگ، ہیرے زمرد، یاقوت کے کانٹے، گلے اور ہاتھوں کے سیٹ الگ، سونے کا پاندان، سونے کا اگالدان، سونے کا چھپر کھٹ، سواسو جوڑے۔ ہر جوڑا گوٹے ٹھپے سے لیس مہندی کے روز ہی جہیز اور لین دین کی پوری فہرست سلامت یار جنگ نے بھجوادی تھی۔ تاکہ اہل دعیال کے سامنے اعلان کر دیا جائے۔ شادی کے دعوتی رقعے چھپوانے میں ایک جدت یہ برتی گئی کہ سونے کے پتروں پر حروف کھدوائے گئے تھے۔

جس دن شادی کی بارات چڑھی، حیدرآباد کی سڑکوں کا یہ عالم تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ بیٹی والوں کی شان ایک طرف، دولہا والے جب نکلے تو چڑھاوے کا وہ عالم تھا کہ یہاں سے وہاں تک سوا چاندی کے تھالوں طشتوں کے کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں "خانگی امین (باوردی، سپاہی)" ان تھالوں کی حفاظت کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ جو لاکھوں روپے کے سامان اور زیور سے بھرے ہوئے تھے۔

بارات چارمینار کی چوڑی چکلی سڑک سے ہوتی ہوئی جب معظم جاہی روڈ تک پہنچی تو نکاح کا وقت جو رقعوں میں پانچ بجے شام کھدوایا گیا تھا ٹل کر سات کے قریب پہنچ چکا تھا ــــ اور ابھی بھی اونچی اونچی شکر میں بگھیاں، ٹانگے، ہاتھ رکشائیں اور موٹریں خراماں خراماں دلہن کی ڈیوڑھی تک پہنچنے ہی جارہی تھیں۔

نکاح میں آدھ پون گھنٹے کی دیر ہوئی کہ مما جانی نے اس سنہری صندقچی کا جائزہ لیا جس میں دولہن کو نکاح سے پہلے چڑھایا جانے والا زیور بند تھا کھول کر دیکھا تو یاد آیا کہ سب سے قیمتی کوئی سوا لاکھ کا جو ہیروں کا سیٹ تھا وہ حویلی میں ایک الماری میں ہی بھول آئی ہیں۔ دو چار آدمیوں کو دوڑا کر انھوں نے اعتماد الدولہ کو اندر زنان خانے کے دروازے تک بلایا اور گھبرا کر کہا " اُجاڑ یا دیو مٹی پڑو۔ وہ اصلی زیور تو میں حویلی میں اچ بھول آئی آپ جلدی جاکر لائیو نہیں تو بڑی بھد اُڑیں گی ۔"

نواب صاحب نے کچھ ناک کان چڑھانے چاہے تو وہ ہولا کر بولیں

" اَیو آپ خود چ جا کو لاؤ جی ۔ اتنا بھاری زیور ۔ میں کسی کا بھروسہ نئیں کر سکتی "

ناچار نواب صاحب خود ہی موٹر پہ بیٹھے، ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی چلائی ۔ سجی سجائی مگر اس وقت خالی ڈھنڈار حویلی میں گھستے چلے گئے ۔ جس کمرے میں دلہن کو لاکر اتارنا تھا ۔ وہ مما جانی کے کمرے سے ہی ملا ہوا تھا الماری کھول کر انھوں نے ہیروں کا سیٹ نکالا ۔ اُلٹے پیروں واپس ہونے ہی کو تھے کہ ہچکیاں اور سسکیاں سنائی دیں ۔" ساری حویلی تو اُٹھ کو سمدھیانے گئی ہے ۔ اب یہاں کون رونے بیٹھا ہے ۔ انہوں نے منہ ہی منہ میں کہا اور کمرے میں جھانکا ۔

زرتار پھولوں سے لدی مسہری کے ایک کونے پر سر ٹکائے صندل بلے تابانہ رو رہی تھی ۔

" صندل ۔ تو ۔ ؟ نواب صاحب حیرت سے بولے : " کیا ہوا تجھے

شادی میں کیوں نہیں گئی تو ؟"

صندل نے آج تک کبھی نواب صاحب کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت تک نہیں کی تھی۔ لیکن آج محبت کی مارنے اسے ہر خوف اور ہر ڈر بھرے جذبے سے آزاد کر دیا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور بلکتی ہوئی نواب صاحب کے سینے سے جا لگی،

"بابا حضور۔۔۔۔۔"

نواب صاحب کا دل دھڑک اٹھا۔

"کیا ہوا صندل ــــ تو اتنا رو کیوں رئی ہے۔ ؟" وہ گھبرا گئے۔

صندل جگر پھاڑ کر بولی" آج میرے پیٹ میں بچّہ ہوتا تو بھری محفل میں بدنام کر دیتی کہ دیکھو لوگوں یہی وہ آدمی ہے جس نے مجھ کنواری کو پھل دیا۔ اور آپ دولہا بن کو بیٹھا ہے۔ پر میں تو وہ بدنصیب ہوں بابا حضور جو لُٹ کر بھی نہ لٹی۔۔۔۔"

نواب صاحب نے رُک رُک کر صدمے کے ساتھ پوچھا "کیا یوسف پاشا تم کو کچھ بولے ؟"

"بولے ؟" وہ روتے روتے غصّہ اور طنز کے ساتھ بولی: اس ایک بول نے تو میری زندگی اجاڑ کر دی کہ میں تم سے شادی کر لیوں گا۔" وہ پھر رونے لگی بابا حضور میں اسی ایک بول پر اپنے کو مٹا بیٹھی، لٹا بیٹھی، نئیں تو بابا حضور میں عورت نہیں تھی چٹان تھی۔۔۔۔۔ ایک اچ وعدہ نے میرے کو تباہ کر دیا۔۔۔۔"

"یوسف پاشا تجھ سے وعدہ کئے تھے کہ شادی کر لیوں گا ؟ نواب صاحب انگلی اُٹھا کر بولے" سچ بولتی تو ؟"

جی ہو بابا حضور ــ سچی میں جھوٹ نہیں بولتی ــ" وہ سسکتے ہوئے کہنے لگی۔" اسی واسطے میں جھک بھی گئی تھی بابا حضور ۔ نئیں تو میں اتنی کچی نہیں تھی ۔ دلہن بننے کی چاہت یں میں تو اُجڑ گئی ــ بابا حضور ...."

نواب صاحب نے لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔" ایسے بدشگونی کی باتاں مت کر صندل بیٹی ۔ ــ" وہ اس کا سر اٹھا کر بولے۔" بیگم صاحبہ تیرے کو یوسف پاشا کی شادی کے واسطے کوئی بھاری جوڑا نہیں سلائے ۔ ؟"

سلائے تو ـــ مگر میرا دل پہننے کو نیئں چاہا ۔"

" اچھا جا ۔ جلدی سے وہ جوڑا تو پہن لے ۔"

ایک ہاتھ میں ہیروں کا سیٹ، اور دوسرے ہاتھ میں صندل کا ہاتھ تھامے نواب اعتماد الدولہ گاڑی سے اُترے ۔ زنان خانے میں جا کر بیوی کو بلایا، حکم دیا ۔" چڑھاوے کا سارا زیور، ہیروں کے سٹ سمیت صندل کو پہنا دیو ۔"

یہاں سے وہاں تک ساری حویلی میں کھلبلی مچ گئی ۔ بیگم صاحبہ ہاں، ہاں کرنے لگیں تو چلا کر بولے ۔" جو ہم کہتے ہیں وہ کرو ۔ آپ کو معلوم ہم جو بہتر سمجھتے ہیں وہ کرتے ہیں ۔ وہ غصہ میں سدا خود کو "ہم" بولنے لگتے تھے ۔

بھری محفل اور سجی مسند سے یوسف میاں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا زنان خانے میں لائے ، صندل کے چہرے سے زرتار گھونگھٹ اٹھا کر بولے ۔" اس لڑکی کو پہچانتے ہو میاں ؟"

یوسف میاں کچھ نہ بولے ۔ نواب صاحب نے کہا ۔ گود گرم کرتے

چلے جاتے ۔ ہم کو اعتراض نہ ہوتا ، مگر میاں تم شادی کا وعدہ کرے اور توڑ دیتے ۔۔ یہ مردوں کی زبان جو ہے ۔" انھوں نے اپنی زبان نکال کر انھیں دکھائی ۔ " ایک بار جو کہہ دے پورا بھی کرتی ہے ۔" وہ نرم لہجے میں گرجے ۔" میں آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں یوسف میاں کہ آپ صندل بیگم سے خوشی خوشی شادی کریں گے ۔ اور اسے خوش بھی رکھیں گے ۔"

یوسف میاں نے سر اٹھا کر انھیں دیکھا تو وہ اسی لہجے میں کہے گئے ۔ زلیخا بڑے باپ کی بیٹی ہے ۔ اس کو تم نہیں بھی بیاہے تو اس کو تم سے اچھے دس بر مل جائیں گے ۔ مگر اس دل کو توڑ کر تم سکھ سے رہ سکیں گے میاں ؟"

یوسف میاں نے ذرا ڈرتے سہمتے پاس کھڑی ہوئی صندل کی طرف اک نگاہ کی ہی تھی کہ نواب صاحب کے چہرے پر گلال سا بکھر گیا ۔ مسکراتے ہوئے انھوں نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا مردانے کی طرف جاتے ہوئے بولے ۔

" میں دلہن کا باپ ہوں ۔۔ سوا لاکھ سے کم مہر پر شادی نہیں ہونے دوں گا ۔۔ سمجھے دولہا میاں ؟"

ذرا ہور اُپرّ

نوّاب صاحب نوکر خانے سے جھومتے جھامتے نکلے تو اصلی چنبیلی کے تیل کی خوشبو سے ان کا سارا بدن مہکا جا رہا تھا۔

اپنے شان دار کمرے کی بے پناہ شان دار مسہری پر آ کر وہ دھپ سے گرے تو سارا کمرہ معطر ہو گیا ــــ پاشا دلہن نے ناک اٹھا کر فضا میں کچھ سونگھتے ہی خطرہ محسوس کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ نواب صاحب کے پاس پہنچ چکی تھیں ــــ سراپا انگارہ بنی ہوئی۔

"سچی سچی بول دیو آپ کاں سے آرئیں ــ جھوٹ بولنے کی کوشش نکّو کرو۔"

نواب صاحب ایک شان دار ہنسی ہنسے۔

"ہمنا جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جو تمے سمجھے دو ہیچ سچ ہے۔"

"گل بدن کے پاس سے آرئیں نا آپ؟"

"معلوم ہے تو پھر پوچھنا کاٹے کو ؟"

جیسے آگ کو کسی نے بارود دکھا دی ہو۔ پاشا دلہن نے دھنا دھن پہلے تو تکیہ کوٹ ڈالا۔ پھر ایک ایک چیز اُٹھا اُٹھا کر کمرے میں پھینکنی شروع کر دی ساتھ ہی ساتھ ان کی زبان بھی چلتی جا رہی تھی۔

"اُجاڑ اُٹھے ابا جان اور امی جان کیسے مردوئے کے حوالے میرے کو دیئے غیرت شرم تو چھو کو بھی نئیں گئی! دنیا کے مردوئے ادھر اُدھر تاک جھانک کرتے نہیں کیا، ین انے تو میرے سامنے کے سامنے اودھم مچالے رہئیں۔ ہور ا جاگری تو دیکھو کتے مزے سے بولتیں، معلوم ہے تو پھر پوچھنا کاٹے کو! ین بولتیوں اجاڑ یہ آگ ہے کیسی کی بجھتی اچ نہیں۔ کتے عورتاں والے ایک مردوئے کو ہوناجی" — اب وہ ساتھ ساتھ پھپھک پھپھک کر رونے بھی لگی تھیں — "اُجاڑ میرے کو یہ زندگی نکو۔ اپنا راج محل تچ سنبھالو — میرے کو آج طلاخ دے دیو — ین ایسی کال کونڈی میں نئیں رہنے والی ....."

مگر جو پیاسا زور کی پیاس میں پانی چھوڑ شراب پی کر آیا ہو۔ وہ بھلا، کہیں اتنی دیر تک جاگتا ہے؟ اور عورت کی گرمی ملے تو یوں بھی اچھا بھلا مرد پٹ کر کے سو جاتا ہے — نواب صاحب بھی اس وقت اس تمام ہنگامے سے بے خبر گہری نیند سو چکے تھے۔

کیسی زندگی پاشا دلہن گزار رہی تھیں! بیاہ کر آئیں تو بیس سے ادھر ہی تھیں۔ اچھے بُرے کی اتنی بھی تمیز نہ تھی کہ میاں کے پیر کھسیں تو رات بے رات خود ہی دبا دیں۔ جوانی کی نیندیں بھی کیسی ہوتی ہے۔ کوئی گھر لوٹ کر لے جائے اور آنکھ تک نہ پھڑکے۔ جب بھی راتوں میں نواب صاحب

نے درد کی شکایت کی، انھوں نے ایک کروٹ لے کر اپنے ساتھ آئی باندیوں میں سے ایک آدھ کو بیاں کی پائنتی بٹھادیا اور اسے ہدایت کردی "لے ذرا سرکار کے پاؤں دبا دے۔ میرے کو تو نیند آرئی۔"

صبح کو یہ خود بھی خوش باش اٹھتیں۔ اور نواب صاحب بھی۔ کبھی کبھار نواب صاحب لگاوٹ سے شکایت بھی کرتے ــ "بیگم آپ کبھی تو ہمارے پاواں دبا دیو، آپ کے ہاتھوں میں جو لذّت ملے گی وہ اِ نے حرام زادیاں کاں سے لائیں گے۔

مگر یہ بلبلا جاتیں ــ "ہور یہ ایک نوی بات سنو، میں کبھلا پاواں دبانے کے بلائخ ہوں کیا۔ اس واسطے تو امّی جان باندیاں کی ایک فوج میرے ساتھ کر کو دئے کہ بیٹی کو تکلیف نئیں ہونا بول کے۔"

اور نواب صاحب دل میں بولتے ــ خدا کرے تم ہور گہری نیند سو۔ تمہارے سوتے اچ ہمارے واسطے تو جنت کے دروازے کھل جاتیں۔

مگر دھیرے دھیرے پاشا دلہن پر یہ بھیدیوں کھلا کہ نواب صاحب نئی نویلی دلہن سے یک سرے گانہ ہوتے چلے گئے ــ اب بیاہی بھری تھیں اتنا تو معلوم ہی تھا کہ جس طرح پیٹ کی ایک بھوک ہوتی ہے اور بھوک لگنے پر کھانا کھایا جاتا ہے۔ اسی طرح جسم کی ایک بھوک ہوتی ہے اور اس بھوک کو بھی بہر طور مٹایا ہی جاتا ہے۔ پھر نواب صاحب ایسے کیسے مرد تھے کہ برابر میں خوشبوؤں میں بسی دلہن ہوتی اور وہ ہاتھ تک نہ لگاتے اور اب تو یہ بھی ہونے لگا تھا کہ رات بے رات کبھی ان کی آنکھ کھلتی تو دیکھتیں کہ نواب صاحب مسہری سے غائب ہیں۔

اب غائب ہیں تو کہاں ڈھونڈیں۔ حویلی بھی تو کوئی ایسی ویسی حویلی تھی ۔ حیدرآباد دکن کے مشہور نواب ریاست یار جنگ کی حویلی تھی کہ پوری حویلی کا ایک ہی چکر لگانے بیٹھو تو موٹی ٹانگیں ٹوٹ کے چورا ہو جائیں۔ پھر رفتہ رفتہ آنکھیں کھلنی شروع ہوئیں۔ کچھ ساتھ کی بیا ہی سہیلیوں کے تجربوں سے پتہ چلا کہ مرد پندرہ پندرہ بیس بیس دن ہاتھ تک نہ لگائے راتوں کو مسہری سے غائب ہو جائے تو دراصل معاملہ کیا ہوتا ہے ۔ لیکن یہ ایسی بات تھی کہ کسی سے کچھ بولتے بنتی نہ بتاتے ۔ مشورہ بھی کرتیں تو کس سے؟ اور کرتیں بھی تو کیا کہہ کر، کیا یہ کہہ کر میرا میاں عورتوں کے پھیر میں پڑ گیا ہے، اسے بچاؤں کیسے ۔ ؟ اور صاف سیدھی بات تو یہ تھی کہ مرد وہی بھٹکتے ہیں جن کی بیویاں میں انھیں اپنے گھٹنے سے باندھ کر رکھنے کا سلیقہ نہیں ہوتا ۔ وہ بھی تو آخر مرد ہی ہوتے ہیں جو اپنی ادھیڑ ادھیڑ عمر کی بیویوں سے گوند کی طرح چپکے رہتے ہیں۔ غرض ہر طرف سے اپنی ہاری ابنی ماری تھی ۔ لیکن کر بھی کیا سکتی تھیں خود میاں سے بولنے کی تو کبھی ہمت ہی نہ پڑی ۔ مرد جب تک چوری چھپے منہ کالا کرتا ہے۔ ڈرا سہما ہی رہتا ہے ۔ اور جہاں بات کھل گئی وہیں اس کا منہ بھی کھل گیا۔ پھر تو ڈنکے کی چوٹ کچھ کرتے نہیں ڈرتا ۔ لیکن ضبط کی بھی ایک حد ہوتی ہے ۔ ایک دن آدھی رات کو یہ تاک میں بیٹھی ہوئی تھیں ۔ آخر شادی کے اتنے سال گزار چکی تھیں ۔ دو تین بچوں کی ماں بھی بن چکی تھیں ۔ اتنا حق تو رکھتی ہی تھیں ۔ اور عقل بھی کہ آدھی رات کو جب مرد کہیں سے آئے اور یوں آئے کہ چہرے پر یہاں وہاں کالک ہو تو وہ سوا پرائی عورت کے کاجل کے اور کاہے کی کالک ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ بہرحال دنیا میں اب تک یہ تو نہیں ہوا ہے کہ کسی کے گناہوں سے مونہہ کالا ہو جائے ۔

جیسے ہی نواب صاحب کمرے میں داخل ہوئے کہ چیل کی طرح جھپٹیں اور

ان کے چہرے کے سامنے انگلیاں نچاکر بولیں" یہ کالک کاں سے بھقوپ کولائے؟ اور نواب صاحب بھی آخر نواب ہی تھے، کسی حرام کا تخم تو تھے نہیں، اپنے ہی باپ کی عقد خوانی کے بعدوالی حلال کی اولاد تھے۔ ڈرتا ان کا جوتا۔ بڑے رسان سے بولے "یہ مہرو کمبخت بہوت کاجل بھرتی اپنے آنکھاں میں۔ لگ گیا ہوئینگا، اسی کا"

ایسے تیہسے تو پاشادلہن اٹھی تھیں مگر یہ سن کر دہیں ڈھیر ہوگئیں۔ اگر مرد ذرا بھی آناکانی کرے تو عورت کو گالیاں پیٹنے کا موقع مل جاتاہے۔ لیکن یہاں تو صاف سیدھی طرح انھوں نے گویا اعلان کردیا کہ ہاں، ہاں، میں نے بھاڑ جھونکا۔ اب بولو!

پاشادلہن کچھ بول ہی نہ سکیں، بولنے کو تھا بھی کیا، جو چپکی ہوئیں تو بس چپ ہی لگ گئی۔۔ اب محل کے سارے ہنگامے، ساری چہل پہل، ساری دھوم دھام ان کے لئے بے تکی تھی۔ درنہ وہی پاشادلہن تھیں کہ ہر کام میں گھسی پڑتی تھیں پہلے تو دل میں آیا کہ جتنی بھی یہ جوان جوان حرام خوریاں ہیں انھیں سب کو ایک سرے سے برطرف کردیں، لیکن روایت سے اتنی بڑی بغاوت کر بھی کیسے سکتی تھیں۔ پھر اپنے مقابل کی حیثیت والیوں میں یہ مشہور ہو جاتا کہ اللہ مارے کیسے نواباں ہیں کہ کام کاج کو چھوکریاں، تک نہیں رکھے! بس ہر طرف سے ہار ہی ہار تھی۔ دل پر دکھ کی مار پڑی تو جیسے ڈھیر ہی ہوگئیں۔ نئی نئی بیماریاں بھی سر اٹھانے لگیں۔۔۔ کمر میں درد سر میں درد، پیروں میں درد، ایک اینٹھن تھی کہ جان لئے ڈالتی۔ حکیم صاحب بلوائے گئے۔ اس زمانے کے حیدرآباد میں مجال تھی کہ حکیم صاحب محل والیوں کی جھپک تک دیکھ سکیں۔ بس پردے کے پیچھے سے ہاتھ دکھا دیا جاتا۔ پھر ساتھ ہی ایک ملی بی ہوتیں جو حکیمن اماں کہلاتی تھیں۔۔ وہ سارے معائنے کرتیں اور دوا دارو تجویز

ہوتی۔ بس حکیم صاحب نبض دیکھنے کے گناہ گار ہوتے۔

پاشا دلہن کی کیفیت سن کر حکیم صاحب کچھ دیر کے لئے خاموش رہ گئے اُنھوں نے بظاہر غیر متعلق سی باتیں پوچھیں جس کا دراصل اس بیماری سے بڑا گہرا تعلق تھا۔

"نواب صاحب کہاں سوتے ہیں؟"

حکیمن اماں نے پاشا دلہن سے پوچھ کر بات آگے بڑھائی ——"جی انوں تو مردانے میں اِچ سوتے ہیں۔

اب حکیم صاحب بالکل خاموش رہ گئے۔ سوئے اَدب! کچھ کہتے تو مشکل نہ کہتے تو مشکل۔ بہرحال ایک تیل مالش کے لئے دے گئے۔

پاشا دلہن کو ان کمبخت باندیوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ بس نہ چلتا کہ سامنے آئیں اور یہ کچا چبا جائیں۔ باندیوں میں سے کسی کو اُنھوں نے اپنے کام کے لئے نہ چنا۔ حویلی کا ہی پالا ہوا ایک چھوٹا سا چھوکرا تھا اُنھوں نے طے کر لیا کہ مالش اسی سے کرائیں گی، چودہ پندرہ برس کے چھوکرے سے کیا شرم؟

اسی بیچ میں دو تین بار نواب صاحب اور دلہن پاشا کی خوب زوردار لڑائی ہوئی، شکر ہے کہ جو نوبت طلاق تک نہ پہنچی —— اب تو نواب صاحب کھلم کھلا کہتے تھے ——"ہاں ہیں آج اس کے ساتھ رات گزارا —— اس کے ساتھ مستی کیا —— تم نا کچھ بولنا ہے۔؟"

پاشا دلہن بھی جی کھول کر کوستیں کاٹتیں، ایک دن بُرے الفاظ میں جب اُنھوں نے اپنی "بھوک" کا ذکر کیا تو نواب صاحب ذرا حیرت سے انھیں دیکھ کر بولے "دیکھو اللہ میاں کو معلوم تھا کہ مرد کو کچھ زیادہ ہونا پڑتا اس واسطے اِچ اللہ میاں نے

چار، چار شادیوں کی اجازت دیا۔ ایسا ہوتا تو عورتاں کو کیوں نہیں دے دیتا تھا؟"
یہ ایک ایسا نکتہ نواب صاحب نے پکڑا کہ پاشا دلہن تو بالکل ہی لاجواب ہوکر رہ گئیں
اور یوں رہی سہی جو بھی پردہ داری تھی بالکل ہی ختم ہوکر رہ گئی ۔ اس صبح ہی کی بات
تھی کہ انھوں نے سر میں تیل ڈالنے کو چنبیلی کے تیل کی شیشی اٹھائی اور وہ کمبخت ہاتھ
سے ایسی چھوٹی کہ ندی سی بہہ اٹھی ۔ گھبرا کر انھوں نے پاس کھڑی گل بدن کو پکارا ۔
"۔ بیکار بہہ کو جا را تو اچ اپنے سر میں چپڑلے ۔"
اور رات کو وہ ساری خوشبو نواب صاحب کے بدن میں منتقل ہوگئی جس کے
بارے میں اعلان کرتے ہوئے انھیں ذرا سی جھجک یا شرم محسوس نہیں ہوئی ۔
پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ عورت بیسی اور گھیسی ۔ عورت تو تیس
کی ہوکر کچھ اور ہی چیز ہوجاتی ہے ۔ ان دنوں کوئی پاشا دلہن کا روپ دیکھتا ۔
چڑھتے چاند کی سی جوانی ۔ پور پور چٹخا پڑتا ۔ برسات کی راتوں میں ان کے جسم
میں وہ تناؤ پیدا ہوجاتا جو کسی استاد کے کسے ہوئے ستار میں کیا ہوگا ۔ اتنا سا چھوکرا
کیا اور اس کی بساط کیا ۔ سر اور کمر سے ہٹ کر وہ پیروں کے پاس آکر بیٹھتا
تو اس کے ہاتھ دکھ دکھ جاتے ۔ پنڈلیوں کو جتنی زور سے دباتا ، وہ یہی کہے جاتیں ۔
"کتے! ہلو ہلو دباتا ہے تو — ذرا تو طاقت لگا۔"
چودہ پندرہ سال کا چھوکرا ، ڈر ڈر کے سہم سہم کر دبائے جاتا کہ کہیں زور سے
دبا دینے پر پاشا ڈانٹ نہ دیں ۔ اتنی بڑی حویلی کی مالک جو تھیں ۔
حویلی میں ان دنوں خواتین میں کلی دار کرتوں پر چوڑی دار پاجامے پہننے کا رواج
تھا ۔ لڑکیاں بالیاں غرارے بھی پہن لیتیں — اور بڑے ہنگاموں کے بعد اب ساڑی
کا بھی نزول ہوا تھا ۔ مگر بہت ہی کم پیمانے پر ۔

چوڑی دار پاجامے میں پنڈلیاں صرف دبائی جاسکتی تھیں، تیل مالش کیا خاک ہوتی
پاشا دلہن نے ماما کو بلوا کر اپنے پاس کھڑا کیا۔ یہ حویلی کے کسی بھی نوکر کے لئے بڑے اعزاز
کی بات تھی۔ پھر پاشا بولیں:۔

" دیکھو یہ اپنے چھوکرا رحمت ہے نا؟ اس کو کھانے پینے کو اچھا اچھا دیو۔
ناشتے میں اصلی گھی کے پراٹھے بھی دیو۔ اِسنے میرے پیراں کی مالش کرتا۔ مگر ذرا
بھی اس میں طاقت نہیں۔ اب میں جتا کو دی۔"

پھر خود انھوں نے غرارہ پہننا شروع کر دیا۔ تاکہ پنڈلیوں کی اچھی طرح مالش
ہوسکے اور انھیں درد سے نجات ملے۔

اب جب دوپہر کو مالش شروع ہوتی تو ایک ہی مکالمے کی گردان رحمت
کے کانوں سے ٹکراتی۔

" ذرا ہور اوپر!"

وہ سہم سہم کر مالش کرتا۔ ڈر ڈر کر پاشا کا منہ تکتا۔ تیل میں انگلیاں چپڑ کر وہ
غرارہ ڈرتے ڈرتے ذرا اوپر کھسکاتا کہ کہیں مشجر، اطلس، یا کمخواب کے غرارے
کو تیل کے دھبے بدنما نہ بنادیں۔ چم چماتی پنڈلیاں تیل کی مالش سے آئینہ بنتی جارہی
تھیں۔ رحمت غور سے دیکھتے دیکھتے گھبرا گھبرا اٹھتا کہ کہیں ان میں اس کا چہرہ نہ دکھائی
دے جائے۔

ایک رات دلہن پاشا کے پیروں میں کچھ زیادہ ہی درد اور اینٹھن تھی۔
رحمت مالش کرنے بیٹھا تو سہمتے سہمتے اس نے پنڈلیوں تک غرارہ کھسکایا۔
" ذرا ہور اوپر" دلہن پاشا کسمسا کر بولیں۔ آج اُجاڑ اِتّا درد ہوریا کہ میرے
کو بخار جیسا لگ ریا۔ گھٹنوں تک مالش کر ذرا۔ تو تو خالی بس پنڈلیاں اچ دباریا۔"

رحمت نے بخار کی سی کیفیت اپنے اندر محسوس کی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے غرارہ اور "اُوپر" کھسکایا اور ایک دم ناریل کی طرح چکنے چکنے اور سفید مدّور گھٹنے دیکھ کر بوکھلا سا گیا۔ تر تراتے گھی کے پراٹھوں، دن رات کے بھوٹوں اور مرغن کھانوں نے اسے وقت سے ذرا پہلے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا، جہاں نیند کے بجائے جاگتے میں ایسے ویسے خواب دکھائی دینے لگتے ہیں — اس نے ہڑبڑا غرارہ ٹخنوں تک کھینچ دیا۔ تو اونگھتی ہوئی پاشا دلہن بھنّا گئیں۔

" ہورے، میں کیا بول رئی، ہورے تو کیا کر ریا ؟" — انھوں نے ذرا سا سر اٹھا کر غصّے سے کہا۔ وہاں ان کے سرہانے سنسناتا ہوا، جوان ہوتا ہوا۔ وہ چھوکرا بیٹھا تھا جسے انھوں نے اس لئے چنا تھا کہ انھیں چھوکریوں سے ازحد نفرت ہوگئی تھی کہ کم بختیں ان کے میاں کو ہتھیا لیتی تھیں۔

انھوں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس نے بھی ڈرتے ڈرتے سہی، مگر ذرا غور سے انھیں دیکھا اور اک دم سر جھکا لیا۔

ٹھیک اسی وقت نواب صاحب کمرے میں داخل ہوگئے۔ جانے کون سا نشہ چڑھا کر آئے تھے کہ جھولے ہی جا رہے تھے۔" آنکھیں چڑھی پڑ رہی تھیں۔ مگر اتنے نشے میں بھی بیگم کے قدموں میں اسے بیٹھا دیکھ کر چونک اُٹھے۔

"یہ اِلے حرام زادہ مسٹنڈا یہاں کیا کرنے کو آیا بول کے ؟"

رحمت تو نواب صاحب کو دیکھتے ہی دُم دبا کر بھاگ گیا۔ مگر پاشا دلہن بڑی رعونت سے بولیں "آپ کو میرے بیچ میں بولنے کا کیا حق ہے۔؟"

"حق ؟" وہ گھور کر بولے " تمہارا دھگڑا ہوں، کوئی پالکڑا نہیں سمجھے ! رہی حق کی بات، سو یہ حق اللہ اور اس کا رسول دیا — کون تھا وہ مردود ؟"

آپ اِتّے سالاں ہو گئے، آپ ایکو ایک چھوکری سے پاواں دبالے رئیں، ہور اللہ معلوم ہور کیا کیا تماشئے کرلے رئیں، وہ سوب کچھ نئیں، ہور یں کبھی دُکھ میں بیماری میں مالش کرالنے ایک آدھ چھوکرے کو بٹھالی تو اِتّے حساباں کاٹے کو؟

"اس واسطے کی مرد بولے تو دالان میں بچھا خالین ہوتا کہ کِتّے بھی پاواں اس پہ پڑسے تو کچھ فرخ نئیں پڑتا۔ ہور عورت بولے تو عزّت کی سفید چادر ہوتی کہ ذرا بھی دھبّا پڑا تو سب کی نظر پڑ جاتی۔"

دلہن پاشا بلبلا کر بولیں "ائی اماں، بڑی تمہاری عزّت جی۔ ہور تمہاری بڑی شان! اپنے دامن میں اِتّے داغاں رکھ کو دوسرے کو کیا نام رکھتے جی تمے! ہور کچھ نہیں کچھ نہیں تو اِتّے سے پوٹے کے اُپر اِتّا واویلا کر لیتے بیٹھیں۔"

اک دم نواب صاحب چلّائے، "تمنا وہ پوٹا اِتّا اِتّا ساد کھتا؟ ارے آج اس کی شادی کردو نو مہینے میں باپ بن کر دکھا دیں گا۔ یں جتا دیا آج سے اس کا پاؤں نئیں دِکھنا تمہارے کمرے میں۔

پاشا دلہن تن کر بولیں "ہور دکھا تو؟"

"دکھا تو طلاخ" وہ آخری فیصلہ سناتے ہوئے بولے۔

"ابھی کھڑے کھڑے دے دیو۔" پاشا دلہن اسی تیہے سے بولیں۔

ایک دم نواب صاحب سٹ پٹا کر رہ گئے۔ بارہ تیرہ سال میں، کتنی بار تو تو میں میں ہوئی۔ کتنے رگڑے جھگڑے ہوئے —— باعزّت، باوقار، دو خاندانوں کے معزز میاں بیوی، جو پہلے ایک دوسرے کو 'آپ، آپ' کہتے نہ تھکتے تھے، اب تم تمار تک آگئے تھے، مگر یہ نوبت تو کبھی نہ آئی تھی، خود پاشا دلہن نے ہی کئی بار یہ پیش کش کی کہ ایسی زندگی سے تو اُجاڑ میرے کو طلاخ دے دیو — لیکن

یہ کبھی نہ ہوا تھا کہ خود نواب صاحب نے یہ فال بد منہ سے نکالی ہو — اور اب منہ سے نکالی بھی تو یہ کہاں سوچا تھا کہ وہ کہیں گی کہ ہاں "ابھی کھڑے کھڑے دیو !!"

مگر پاشا دلہن کی بات پوری نہیں ہوئی تھی۔ ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے وہ تمتماتے چہرے کے ساتھ بولیں۔" ہور طلّاخ لئے بعد سارے حیدرآباد کو سناتی پھروں گی کہ تمے عورت کے لائق مرد نئیں تھے۔ یہ نیچے تمہارے نیئں — اب چھوڑو میرے کو! ہور دیو میرے کو طلاخ!"

یہ عورت چاہتی کیا ہے آخر — ؟ نواب صاحب نے سر پکڑ لیا۔ انھوں نے ذرا شک بھری نظروں سے بی بی کو دیکھا — کہیں دماغی حالت مشتبہ تو نہیں وہ سنا رہی تھیں۔

"اس حویلی میں دکھ اٹھائی نائیں — تمہارے ہوتے اب سکھ بھی اٹھاؤں گی — تمہارے اِچ ہوتے سن لیو۔"

دوسری رات پاشا دلہن نے سرسراتی ریشمی ساڑی اور لہنگا پہنا۔ خود بھی تو ریشم کی بنی ہوئی تھیں۔ اپنے آپ میں پھسلی پڑ رہی تھیں، پھر جب رحمت مالش کرنے بیٹھا تو بس بیٹھا ہی رہ گیا۔

"دیکھتا کیا ہے رے؟ ہاتھوں میں دم نئیں کیا؟"

اس نے سرسراتا لہنگا ڈرتے ڈرتے ذرا اوپر کیا۔

"اس کو مالش بولتے کیا رے نکمے!" ان کی ڈانٹ میں لگاوٹ بھی تھی۔

رحمت نے سرخ ہوتے کانوں سے پھر ادھر سنا — ذرا ہور اُپر۔

"ذرا ہور اُپر —"

گہرے اودے رنگ کا لہنگا اور گہرے رنگ کی ساڑی ذرا اوپر ہوئی اور جیسے بادلوں میں بجلیاں کوندیں ۔

"ذرا ہور اُپّر ۔"

"ذرا ہور اُپر ۔"

"ذرا ہور اُپر ۔"

"ذرا ہور اُپر ۔"

تلملا کر صندل کے تیل سے بھری کٹوری اُٹھا کر رحمت نے دور پھینک دی اور اس بلندی پر پہنچ گیا۔ جہاں تک ایک مرد پہنچ سکتا ہے۔ اور جس کے بعد ذرا ہور اوپر" کہنے سننے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ۔

دوسرے دن پاشا دُلہن پھول کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ صندل ان کی من پسند خوشبو تھی۔ صندل کی مہک سے ان کا جسم لدا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے رحمت سے پانی مانگا تو وہ بڑے ادب سے چاندی کی طشتری میں چاندی کا گلاس رکھ کر لایا۔ جھک کر پانی پیش کیا تو انھیں ایسا لگا کہ وہ صندل کی خوشبو میں ڈوبے جا رہے ہیں۔ گلاس اٹھاتے اُٹھاتے انھوں نے مُڑ کر بیگم کو دیکھا۔ جو ریشمی گدگدے بستر میں اپنے بالوں کا سیاہ آبشار پھیلائے کھلی جا رہی تھیں۔ ایک فاتح مسکراہٹ ان کے چہرے پر تھی ۔

وہ انھیں سنانے کو رحمت کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے بولے "کل تیرے کو گاؤں جانے کا ہے۔ وہاں پو ایک منشی کی ضرورت ہے بول کے ۔"

رحمت نے سر جھکا کر کہا ۔"جو حکم سرکار ۔"

نواب صاحب نے پاشا دلہن کی طرف مسکرا کر دیکھا ۔ ایک فاتح کی

مسکراہٹ۔

دو گھنٹے بعد پاشا دلہن اپنی شان دار حویلی کے بے پناہ شان دار باورچی خانے میں کھڑی ماما کو ہدایت دے رہی تھیں۔

"دیکھو ماما بی، اِسنے یہ اپنی زبیدہ کا چھوکرا ہے ناشرفو —— اس کو ذرا اچھا کھانا دیا کرنا —— آج سے یہ میرے پاؤں دبایا کریں گا۔ مالش کرنے کو ذرا ہاتھا پاؤں میں دم ہونے کو ہونا نا؟"

"برو بر بولتے بی پاشا آپ" ماما بی نے اصلی گھی ٹپکتا انڈوں کا حلوا شرفو کے سامنے رکھتے ہوئے پاشا دلہن کے حکم کی تعمیل اسی گھڑی سے شروع کردی۔

اُترن

نکو اللہ، میرے کو بہوت شرم لگتی ۔"

" ایو اس میں شرم کی کیا بات ہے ؟ میں نیئں اُتاری کیا اپنے کپڑے؟"

"اوں ـــ " چمکی شرمائی

"اب اُتارتی کی بولوں انا بی کو ؟" شہزادی پاشا جن کی رگ رگ میں حکم چلانے کی عادت رچی ہوئی تھی ـ چلا کر بولیں۔

چمکی نے کچھ ڈرتے ڈرتے، کچھ شرماتے شرماتے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پہلے تو اپنا کرتا اُتارا، پھر پاجامہ ـــ پھر شہزادی پاشا کے حکم پر جھاگوں بھرے ٹب میں ان کے ساتھ کود پڑی ۔

دونوں نہا چکیں، تو شہزادی پاشا ایسی محبت سے جس میں غرور اور مالکن پن کی گہری چھاپ تھی، مسکرا کر بولیں " ہو رے تو بتا کی اب تو کپڑے کون سے

پین رئی ؟"

"کپڑے ۔ ؟" چمکی بے حد متانت سے بولی ۔" یہی اچ میرا نیلا کرتا پاجامہ ۔"

" یہی اچ ؟" شہزادی پاشا حیرت سے چلّا کر ناک سکوڑتے ہوئے بولیں ۔" اتّے گندے، بدبودار کپڑے ؟ پھر پانی نہانے کا فائدہ ؟"

چمکی نے جواب دینے کی بجائے الٹا ایک سوال جڑ دیا ۔" ہور آپ کیا پین رئے پاشا ؟"

" میں ؟ شہزادی پاشا بڑے اطمینان اور فخر سے بولیں

" وہ میری بسم اللہ کے وخت چمک چمک کا جوڑا دادی ماں نے بنائے تھے، وئی اچ ۔ مگر تو نے کائے کو پوچھی ؟"

چمکی ایک لمحے کو تو سوچ میں پڑ گئی، پھر ہنس کر بولی " میں سوچ رئی تھی ......" وہ کہتے کہتے رک گئی ۔

" کیا سوچ رئی تھی ؟ " شہزادی پاشا نے بے حد تجسّس سے پوچھا

ایک دم اُدھر سے اناّ بی کی تیز چنگھاڑ سنائی دی ۔

" ہو پاشا، یہ میرے کو حمام میں سے بھگا کے تم اس اجاڑ مار چوٹی کے ساتھ کیا مٹاخے مار لیتے بیٹھیں ؟ جلدی نکلو، نئیں تو بی پاشا کو جا کو بولیتوں"

اپنی سوچی ہوئی بات چمکی نے جلدی سے کہہ سنائی ۔" پاشا میں سوچ رئی تھی کہ کبھی آپ ہور میں" اوڑھنی بدل " بہناں بن گئے تو آپ کے کپڑے میں بھی پہن سکتی نا ؟"

میرے کپڑے ؟ تیرا مطلب ہے کہ وہ سارے کپڑے جو میرے

صندوخاں بھر بھر کو رکھے پڑے ہیں ؟ "

جواب میں جگی نے ذرا ڈر کر، سر ہلایا۔

شہزادی پاشا ہنستے ہنستے دہری ہو گئی — "ایو کتی بے خوف چھوکری ہے ! اگے تو تو نوکرانی ہے۔ تو تو میری اُترن پہنتی ہے، ہور عمر بھر اُترن ہی پہنیں گی،" ۔ پھر شہزادی پاشا نے بے حد محبت سے جس میں غرور اور فخر زیادہ اور خلوص کم تھا، اپنا ابھی ابھی کا، نہانے کے لئے اُتارا ہوا جوڑا اُٹھا کر جگی کی طرف اچھال دیا۔

" یہ لے اُترن پہن لے۔ میرے پاس تو بہوت کپڑے ہیں۔"

جگی کو غصہ آ گیا ۔" میں کائے پہنوں، آپ پہنو نا میرا یہ جوڑا۔" اس نے اپنے میلے جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

" شہزادی پاشا غصّے سے پکاری، " انّا بی ! انابی ...."

انّا بی نے زور سے دروازے کو بھڑ بھڑایا اور دروازہ جو صرف ہلکا سا بھڑا ہوا تھا، پاٹوں پاٹ کھل گیا۔

" اچھا تو آپ صاحبان ابھی تک ننگے اچ کھڑے وے ہیں !" انّابی ناک پر انگلی رکھ کر بناوٹی غصّے سے بولیں۔

شہزادی پاشا نے جھٹ اسٹینڈ پر ٹنگا ہوا نرم نرم گلابی تولیہ اُٹھا کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ جگی یوں ہی کھڑی رہی

انّا بی نے اپنی بیٹی طرف ذرا غور سے دیکھا ۔" ہور تو پاشا لوگاں کے حمام میں کائے کو پانی نہانے کو آن مری ؟"

" یہ انوں شہزادی پاشا نے بولے کی تو بھی میرے ساتھ پانی نہا۔"

انا بی نے ڈرتے ڈرتے ادہر اُدہر دیکھا کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ پھر جلدی سے اسے حمام سے باہر کھینچ کر بولیں" چل، جلدی سے جا کر نوکر خانے میں ۔ نہیں تو سردی وردی لگ گئی تو مرے گی۔"

" اب یہ جیکٹ گوند کپڑے نکو پہین، وہ لال بیٹی میں شہزادی پاشا پرسوں اپنا کرتا، پاجامہ دئے تھے، وہ جا کو پہن لے۔"

وہیں ننگی کھڑی کھڑی وہ سات برس کی ننھی سی جان بڑی گہری سوچ کے ساتھ رک رک بولی، امی جب میں ہور شہزادی پاشا ایک برابر کے ہیں تو الو میری اُترن کیوں نہیں پہنتے۔؟

" ٹھیر ذرا، میں مما کو جا کے بولیتوں کی چھپکی میرے کو ایسا بولی..."

لیکن انا بی نے ڈر کر اسے گود میں اُٹھا لیا۔ "آگے پاشا اُنے تو چھنال پاگل ہولی ہوگئی ہے۔ ایسے دیوانی کے باتاں کاٹے کو اپنے مما سے بولتے آپ؟ اس کے سنگات کھیلنا، نہ بات کرنا، جب اس کے نام یو جوتی مار دیو آپ"

شہزادی پاشا کو کپڑے پہنا کر، کنگھی چوٹی کر کے کھانا، وانا کھلا کر جب سارے کاموں سے نچنت ہو کر انا بی اپنے کمرے میں پہنچیں تو دیکھا کہ چھپکی ابھی تک ننگا جھاڑ بنی کھڑی ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ آتے ہی انھوں نے اپنی بیٹی کو دھنکنا شروع کر دیا

"جس کا کھاتی اُسی سے لڑائیاں مول لیتی —— چھنال گھوڑی! ابھی کبھی بڑے سرکار نکال باہر کر دیئے تو کدھر جائیں گے اِتنے نخرے؟"

انا بی کے حسابوں تو یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ وہ شہزادی پاشا کو دودھ پلانے کے واسطے رکھی گئی تھیں، ان کے کھانے پینے کا معیار تو لازمًا وہی تھا

جو بیگمات کا تھا کہ بھئی آخروہ نواب صاحب کی اکلوتی بچی کو اپنا دودھ پلاتی تھیں
کپڑا لتا بھی بے حساب تھا کہ دودھ پلانے والی کے لئے صاف ستھرا رہنا
لازمی تھا اور سب سے زیادہ مزے تو یہ تھے کہ ان کی اپنی بچی کو شہزادی پاشا
کی بے حساب اترن ملتی تھی ۔ کپڑے لتے ملنا تو ایک طے شدہ بات تھی، حد
یہ کہ اکثر چاندی کے زیور اور کھلونے تک بھی اُترن میں دے دئے جاتے
تھے ۔ ادہر وہ حرافہ تھی کہ جب سے ذرا ہوش سنبھال رہی تھی یہی ضد کئے جاتی تھی
کہ میں بی پاشا کی اترن کیوں پہنوں ؟ کبھی کبھار تو آئینہ دیکھ کر بڑی سوجھ بوجھ
کے ساتھ کہتی " امنی میں تو بی پاشا سے بھی زیادہ خوبصورت ہوں نا ؟ پھر تو
انوں میری اُترن پہنانا ۔ ؟"

انا بی ہر گھڑی ہولتی تھیں ۔ بڑے لوگ تو بڑے لوگ ہی ٹھیرے ۔
اگر کسی نے سن گن پالی کہ موئی انا نا اصل کی بیٹی ایسے ایسے بول بولتی ہے تو
ناک چوٹی کاٹ کر نکال باہر نہ کر دیں گے ؟ ۔ ویسے بھی دودھ پلانے کا زمانہ
تو مدت ہوئی بیت گیا تھا ۔ وہ تو ڈیوڑھی کی روایت کہئے کہ انا لوگوں کی مرے
بعد ہی چھٹی کی جاتی تھی ۔ لیکن قصور بھی معاف کئے جانے کے قابل ہو تو ہی معافی
ملتی ہے ۔ ایسا بھی کیا ؟ انا بی نے چمکی کے کان مروڑ کر اسے سمجھایا ۔

"آگے سے کچھ بولی تو یاد رکھ ــــ تیرے کو عمر بھر بی پاشا کی اترن پہننا
ہے ۔ سمجھی کی نئیں، گدھے کی اولیاد !"

گدھے کی اولیاد نے اس وقت زبان سی لی لیکن ذہن میں لاوا پکتا
ہی رہا ۔

تیرہ برس کی ہوئیں تو شہزادی پاشا کی پہلی بار نماز قضا ہوئی ــــ آٹھویں

دن گل پوشی ہوئی تو ایسا زرتار، جھم جھماتا جوڑا ممّا نے سلوایا کہ آنکھ ٹھیرتی نہ تھی جگہ جگہ سونے کے گھنگھروؤں کی جوڑیاں ٹنکوائیں کہ جب بی پاشا چلیتیں تو چھن چھن پازیبیں سی بجتیں۔ ڈیوڑھی کے دستور کے مطابق وہ حد سے سوا قیمتی جوڑا بھی اُترن بن صدقہ دے دیا گیا۔ انّا بی خوشی خوشی وہ سوغات لے کر پہنچیں تو چمکی جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھ دار اور حساس ہو چکی تھی، دکھ سے بولی: "امنی مجبوری نا ملے لینا ہور بات ہے مگر آپ ایسے چیزاں کو بے کو خوش مست ہوا کرو"

"اگے بیٹا ۔" وہ رازداری سے بولیں: "یہ جوڑا اگر بکانے کو بھی بیٹھے تو دو سو کلدار روپیے تو کہیں نہیں گئے۔ اپن لوگاں نصیبے والے ہیں کہ ایسی ڈیوڑھی میں پڑے۔"

"امنی": چمکی نے بڑی حسرت سے کہا: "میرا کیا جی بولتا کی میں بھی کبھی بی پاشا کو اپنی اُترن دیوں ؟"

انّا بی نے سر پیٹ لیا۔ "اگے تو بھی اب جوان ہوگئی گے ذرا عقل پکڑ، ایسی ویسی باتاں کوئی سن لیا تو میں کیا کروں گی ماں۔ ذرا میرے بڈھے چونڈے پو رحم کر ۔"

چمکی ماں کو روتا دیکھ خاموش ہوگئی۔

مولوی صاحب نے دونوں کو ساتھ ہی ساتھ قرآن شریف اور اردو قاعدہ شروع کرایا تھا۔ بی پاشا نے کم اور چمکی نے زیادہ تیزی دکھائی۔ دونوں نے جب پہلی بار قرآن شریف کا دور ختم کیا تو بڑی پاشا نے ازراہ عنایت چمکی کو بھی ایک ہلکے کپڑے کا نیا جوڑا سلوا دیا تھا۔ ہر چند کہ بعد میں اُسے

بی پاشا کا بھاری جوڑا بھی اُترن میں رل گیا تھا لیکن اسے اپنا وہ جوڑا جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اس جوڑے سے اُسے کسی قسم کی ذلّت محسوس نہیں ہوتی تھی ۔ ہلکے زعفرانی رنگ کا سوتی جوڑا۔ جو کتنے ہی سارے جگمگاتے ہلس لس کرتے جوڑوں سے سوا تھا۔

اب جبکہ خیر سے شہزادی پاشا ضرورت بھر پڑھ لکھ بھی چکی تھیں، جوان بھی ہو چکی تھیں، ان کا گھر بسانے کی فکریں کی جا رہی تھیں۔ ڈیوڑھی، سناروں دزیوں، بیوپاریوں کا مسکن بن چکی تھی۔ چمکی یہی سوچے جاتی کہ وہ تو شادی کے اتنے بڑے ہنگامے کے دن بھی اپنا وہی جوڑا پہنے گی جو کسی کی اُترن نہیں تھا۔

بڑی پاشا، جو واقعی بڑی مہربان خاتون تھیں ہمیشہ اپنے نوکروں کا اپنی اولاد ہی کی طرح خیال رکھتی تھیں۔ اس لئے شہزادی پاشا کے ساتھ وہ چمکی کی شادی کے لئے بھی اتنی ہی فکر مند تھیں۔ آخر نواب صاحب سے کہہ سن کر انھوں نے ایک مناسب لڑکا چمکی کے لئے "تلاش کر ہی لیا۔ سوچا کہ شہزادی پاشا کی شادی کے بعد اسی جھونڈ جھکے" میں چمکی کا بھی عقد پڑھا دیا جائے۔

اس دن جب شہزادی پاشا کے عقد کو صرف ایک دن رہ گیا تھا اور ڈیوڑھی مہمانوں سے ٹھسا ٹھس بھری پڑی تھی۔ اور لڑکیوں کا ٹڈی دَل ڈیوڑھی کو سر پہ اُٹھائے ہوئے تھا۔ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی شہزادی پاشا پیروں میں مہندی لگواتے ہوئے چمکی سے کہنے لگیں "تو سسرال جائے گی تو تیرے پیروں کو میں مہندی لگا دوں گی۔"

"ایو خدا نہ کرے!" انا بی نے پیار سے کہا۔ "اس کے پاؤاں آپ کے دشمناں جھیدئیں۔ آپ ایسا بولے سو بس ہے۔ بس اتی دعا کرنا پاشا کہ آپ کے دولہے

میاں ولیا شریف دولہا اس کا نکل جائے"۔

" مگر اس کی شادی کب ہورئی جی ؟" کوئی چلبلی لڑکی پوچھ بیٹھی۔

شہزادی پاشا کا وہی بچپن والی غرور بھری ہنسی ہنس کر بولیں" میری اِتی ساری اُترن نکلے گی تو اس کا جہیز تیار سمجھو۔۔۔"

اُترن ۔ اُترن ۔ اُترن ۔ کئی ہزار سوئیوں کی باریک باریک نوکیں جیسے اس کے دل کو چھید گئیں ۔ وہ آنسو پیتے ہوئے اپنے کمرے میں آکر چپ چاپ پڑ گئی۔

سرِ شام ہی لڑکیوں نے پھر ڈھولک سنبھال لی ۔ ایک سے ایک واہیات گانا گایا جا رہا تھا۔ پچھلی رات رت جگا ہوا تھا۔ آج پھر ہونے والا تھا۔ ہر لی طرف صحن میں ڈھیروں چولہے چلائے، باورچی لوگ انواع و اقسام کے کھانے تیار کرنے میں مشغول تھے۔ ڈیوڑھی پر رات ہی سے دن کا گمان ہو رہا تھا۔

چمکی کا ردتا ہوا حسن نارنجی جوڑے میں اور کھل اُٹھا۔ یہ جوڑا وہ جوڑا تھا جو اُسے احساس کمتری کے پاتال سے اُٹھا کر، عرش کی بلندیوں پر بٹھا دیتا تھا یہ جوڑا کسی کی اُترن نہیں تھا۔ نئے کپڑوں سے سلا ہوا جوڑا، جو، اُسے زندگی بھر میں ایک ہی بار نصیب ہوا تھا۔ ورنہ ساری عمر تو شہزادی پاشا کی اُترن پہنتے ہی گزری تھی ۔ اور اب چونکہ جہیز بھی تمام تر ان کی اُترن ہی پر مشتمل تھا اس لئے باقی کی ساری عمر بھی اسے اُترن ہی استعمال کرنی ہوگی۔

" لیکن بی پاشا ۔ ایک سیدزادی کہاں تک پہنچ سکتی ہے ۔ یہ تم بھی دیکھ لینا۔ تم نے ایک سے ایک پرانی چیز مجھے استعمال کرنے کو دئے نا؟ اب

تم دیکھنا ....."

ملیدے کا تھال اٹھائے وہ دولہا والوں کی کوٹھی میں داخل ہوئی — ہر طرف چراغاں ہو رہا تھا۔ یہاں بھی وہی چہل پہل تھی جو دلہا والوں کے محل میں تھی۔ صبح ہی عقد خوانی جو تھی۔

اتنے ہنگامے اور اتنی بڑی کوٹھی میں کسی نے اس کا نوٹس بھی نہ لیا پوچھتی یا چھپتی وہ سیدھی دولہا میاں کے کمرے میں جا پہنچی۔ ہلدی مہندی کی ریتوں رسموں سے تھکے تھکائے دولہا میاں اپنی مسہری پر دراز تھے۔ پردہ ہلا تو وہ مڑے — اور دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

گھٹنوں تک لمبا زعفرانی کرتا۔ کسی کسی پنڈلیوں پر منڈھا ہوا تنگ پاجامہ۔ ہلکی ہلکی کامدانی کا کڑھا ہوا زعفرانی دوپٹہ۔ روئی روئی، بھیگی بھیگی گلابی آنکھیں۔ چھوٹی آستینوں والے کرتے میں سے جھانکتی گداز باہنیں۔ بالوں میں موتیا کے گجرے پڑے ہوئے — ہونٹوں پر ایک قاتل سی مسکراہٹ — یہ سب نیا نہیں تھا، لیکن ایک مرد جس کی پچھلی کئی راتیں کسی عورت کے تصور میں بیتی ہوں۔ شادی سے ایک رات پہلے بہت خطرناک ہو جاتا ہے — چاہے وہ کیسا ہی شریف ہو۔

رات جو خود عورت گناہ ہوتی ہے

تنہائی جو گناہوں کی ہمت بڑھاتی ہے۔

چمکی نے انھیں یوں دیکھا کہ وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے — چمکی جان بوجھ کر مونہہ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ تلملائے سے اپنی جگہ سے اٹھے، اور ٹھیک اس کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں کے گوشوں سے چمکی نے انھیں یوں

دیکھا کر وہ ڈھیر ہو گئے۔

تمہارا نام ؟ انھوں نے تھوک نگل کر کہا۔

" چمکی !" اور ایک چمکیلی ہنسی نے اس کے پیارے پیارے چہرے کو چاند کر دیا ۔۔

" واقعی تم میں جو چمک ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ تمہارا نام چمکی ہوتا ..."

انھوں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اس کے شانے پہ رکھا ۔ خالص مردوں والے لہجے میں ، جو کسی لڑکی کو پٹانے سے پہلے خواہ مخواہ کی ادھر ادھر کی ہانکتے ہیں لرزتے ہوئے اپنا ہاتھ شانے سے ہٹا کر اس کے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بولے

" یہ تھال میں کیا ہے ؟

چمکی نے قصداً اُن کی ہمت بڑھائی " آپ کے واسطے ملیدہ لائی ہوں رت جگا تھا نہ رات کو !" اور اس نے تلوار کے بغیر انھیں گھائل کر دیا۔

" موہنہ میٹھا کرنے کو ۔" وہ مسکرائی ۔

" ہم ملیدے ولیدے سے موہنہ میٹھا کرنے کے قائل نہیں ہیں ۔۔ ہم تو۔ ... ہاں ...... " اور انہوں نے ہونٹوں کے شہد سے اپنا موہنہ میٹھا کرنے کو اپنے ہونٹ بڑھائیے۔ اور چمکی ان کے بانہوں میں ڈھیر ہو گئی ۔۔ ان کی پاکیزگی لوٹنے ۔۔ خود لٹنے ۔۔ اور انھیں لوٹنے کے لئے ۔

وداع کے دوسرے دن ڈیوڑھی کے دستور کے مطابق جب شہزادی پاشا اپنی اُترن اپنا سہاگ کا جوڑا اپنی انّا اپنی کھلائی کی بٹیا کو دیے گئیں

تو چمکی نے مسکرا کر کہا۔ " پاشا ..... میں .... میں

" میں زندگی بھر آپ کی اُترن استعمال کرتی آئی ـــــ

مگر اب آپ بھی ....."

اور وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی " میری استعمال کری ہوئی چیز اب زندگی بھر آپ بھی ....." اس کی ہنسی کھمتی ہی نہ تھی ۔

سب لوگ یہی سمجھے کہ بچپن سے ساتھ کھیلی سہیلی کی جدائی کے غم نے عارضی طور سے چمکی کو پاگل کر دیا ہے ۔

بھوک

بڑی پاشا کا غصّہ اپنے شباب پر تھا

"اُجاڑ اُنے دیوان صاحب اِتّا سا کام اب تک کر کو نہیں دئے۔ کِتّے دفعے بول بول کے بھیج دی پر اُنوں کے کاناں جیسے پٹ ہیں — کیا پورے محلّے پڑے ہیں۔ ایک بھی پیٹ والی سیدانی نئیں مِل رئی ہوئیں گی۔؟"

مغلانی بوا بادام، کشمش، منقّہ چھوہارے، میوؤں اور زعفران کے ڈھیر میں ڈوبی بیٹھی تھیں۔ وہیں سے اِک ذرا سر اونچا کر کے بولیں "اوئی پاشا اِتّا گھبرائے بھی نکّو ہوا ابھی دلہن پاشا کی زچگی کو خود دس پندرہ دن پڑے ہیں مِل جائیں گی — گلی گلی سیدانیاں پڑے ہیں ایک چھوڑ دس مِل جائیں گے۔"

تم بھی کیا باتاں کرتے مار، — ایک چھوڑ دس مل رئے — میں بولتیوں ایکچ مل جائے سو غنیمت — ایک دن بھی دیر سے ملی تو ناحق بے چاری دلہن کو تکلیف — "

مغلانی بولنے ذرا گڑبڑا کر بڑی پاشا کو دیکھا

" ہو پاشا نو مہینے پیٹ میں رکھے سو تکلیف نئیں ہوئی ۔ اک ذرا دودھ پلا لینے سے کاٹے کی تکلیف ہو جائیں گی؟ ماں پھر ماں ہوتی اچ ہے ۔ ہور پاشا کوئی میرے سے پوچھے تو میں یہی اِچ بولوں کی سب سے اچھا دودھ اپنی ماں کا ہے "

بڑی پاشانے ذرا تیور بدل کر انھیں دیکھا ۔" یو اور سنو ۔ ہو جی تمے اتا نہیں معلوم دلہن کو سولہواں بھر کو ابھی اِچ سترہواں لگا ۔ اِتی سی جان دھان پان ۔ کیا اُنے بچے کو دودھ پلائیں گی ۔ ؟ اوّل اِچ تو کیسی زرد زعفران ہو کو رہ گئی ۔ اس دن تمے سُنے نئیں بڑے سرکار جو ڈاکٹرنی بھجائے تھے ، اُنے دیکھ کو کیا بولی ۔ ؟ بہوت کم طاقت ہے ۔"

مغلانی بوا کشمش کے تنکے چُنتی چُنتی اسی بے نیازی سے کہے گئیں ۔" ووئی پاشا یہ ڈھونگ دھتورے سوب موئے ڈاکٹران پھیلائے سو ہیں ۔ نئیں تو کدّو کی بیل کو بھی اس کا پھل بھاری نئیں جاتا ۔ یہ تو اِنسان اِچ ہے ۔"

بڑی پاشانے گھور کر مغلانی بُوا کو دیکھا ۔ ان کی بزرگی اور سفید سر آڑے آجاتا تھا ، ورنہ ایسے موقعوں پہ ان کا جی چاہتا بڑھیا کا چونڈا پکڑ کر ڈیوڑھی سے نکال باہر کریں ۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی جب سے وہ بیاہ کر اس ڈیوڑھی میں آئی تھیں ، تب سے ہی زنان خانے میں ہر بات میں مغلانی بوا کا سکہ چلتا تھا ۔ بڑے سرکار کے والد جب تک زندہ تھے ، وہ بھی اس نوکر شاہی سے واقف تھے کبھی کبھار وہ مذاق میں ہنس کر کہہ بھی دیتے تھے "مغلانی بوا ، اب کبھی سرکار سے (ان کا اشارہ حضور نظام فرماں روائے دکن کی طرف ہوتا تھا) ملاقات ہوئی تو

ہم ان کو مشورہ دیں گے کہ آپ ہماری مغلانی بوا کے نام کا سکہ چلا دیو۔"

مغلانی بوا جانے کون سا آب حیات پی کر آئی تھیں کہ بڑی پاشا کے دیکھتے دیکھتے چالیس برس ان پر سے جیسے چالیس مہینے ہو کر نکل گئے تھے ۔ وہی سیاہ بال، وہی مسی بھرے جمے ہوئے دانت وہی مضبوط کاٹھی، اور وہی عمل دخل ۔ سارے پاشا لوگ ان سے ایسے دبتے تھے جیسے سچ مچ وہی گھر کی مالکن تھیں البتہ بڑی پاشا سے ان کی کبھی کبھار بڑی تکرار چلتی تھی۔ ڈیوڑھی میں کتنے زچگی جاپے ہوتے تھے ۔کتنی انائیں، کتنی کھلائیاں مامور کی جاتیں، کوئی حساب ہی نہ تھا۔ لیکن ہر بار مغلانی بوا کا یہی کہنا ہوتا" ماں کا دودھ ضروری نہ ہوتا تو اللہ میاں عورت کے سینے میں دودھ اُتار تا پچ کیوں ؟" مگر ان کی وہی حالت تھی کہ" چاکر لاکھ کا نہ مالک خاک کا۔"

پالکڑیوں، کنیزوں، اور رکھیل چھوکریوں کی ایک پلٹن کی پلٹن بیٹھی زچہ اور کھلائی کی خوراک صاف کرنے میں منہمک تھی کہ اتنے میں باہر سے خواجہ سرا اندر وارد ہوئے" حضور وہ دیوان صاحب تو بڑے سرکار کے ساتھ بگھی پر کہیں تشریف لے گئے ہیں۔ اس واسطے یہ خادم کچھ فرمانا چاہتا ہے۔

خواجہ سرا جو دہلی کی ایک بارات کے کچھ اہل زبان حضرات کے ساتھ چند روز گزار کر خود بھی" زبان دان" بن چکے تھے، ساری ڈیوڑھی کے لئے تفریح کا سامان تھے۔ بڑی پاشا زیر لب مسکرا کر بولیں۔

" اچھا ہوا دیوان صاحب تشریف لے گئے۔ آپ نئیں، نئیں تو یہاں کے سب کاماں چوپٹ ہو جاتے ۔ بولو کیا فرمانا ہے ؟"

"جی ۔ وہ ایک سیدانی شکرام میں بیٹھ کو ایک مردانے ہور زنانی کے

ساتھ آئے ہیں ۔ کرایہ بھی دینا ہے ۔ ہور اُنوں آپ سے ملنا بھی ہے ۔ بولتے یہ چھٹی انوں دئے سو ہے ۔"

بڑی پاشا نے مڑی تڑی چھٹی کو کھول کر دیکھا ۔ ڈیوڑھی کا ہی پتہ تھا ۔ دیوان صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ۔ بڑی پاشا خوش ہو کر بولیں " مغلانی بوا دیکھو تو وہ دیوان صاحب جگہ جگہ بول کو رکھے تھے سو اُن میں سے کوئی آیا کی ۔"

مغلانی بوا کی رہبری میں ایک جوان سی لڑکی ، بڑا سا پیٹ لئے تھکی تھکائی ایک بڑی بی سن کا سفید سر لئے ، میلے کچیلے کپڑے پہنے اور ایک بڑے میاں جھکے جھکے سے ، جیسے دُکھوں کا گٹھڑ سر پہ دھرا ہو کر سر اٹھا کر چلنے نہ دیتا ہو ۔ زنان خانے میں داخل ہوئے تو بڑی پاشا وہیں سے ذرا ترش ہو کر پھٹکاریں " آئی بڑے میاں تم ادریچ رہو ۔ یہاں چھوکریاں گوشہ پردہ ہے ۔"

" جیسی حضور کی مرضی ۔" وہ وہیں ٹھٹھک گئے ۔ بڑی بی اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھیں ۔ لڑکی نے چاندی کے تھالوں میں رکھے ہوئے بادام ، اور کشمش ، چھوہارے ، منقہ ، اور مکھانوں کے ڈھیر کو دیکھا اور زعفران کی بے پناہ خوشبو کو گھونٹ گھونٹ پیتی وہیں ننگے فرش پر بیٹھ گئی ۔ بڑی بی نے سہم کر بیٹی کی وکالت کی " میں کہوں نواں مہینہ بھر اجا رہا ہے ۔ تھکی تھکی جاتی ہے ۔"

" کچھ پروا نیئں ۔" بڑی پاشا رسان سے بولیں ۔ " دائی کتے دناں تبائی ؟"

" بس اسی ہفتے دس دن میں چاند چمکے گا ۔" بڑی بی خوشی خوشی بولیں ۔

بڑی سرکار نے چونک کر انھیں دیکھا اور پوچھا " کہاں کے رہنے والے جی تمے ؟"

" جی ۔ ہم خانماں برباد اسی دہلی کے ہیں جو ہزار بار اُجڑی اور ہزار بار بسی ۔ اب قسمت نے یہاں لا پھینکا ہے ۔ اس سرکار کا نام سن کر چلے آئے تھے ۔ جس

کی بادشاہت میں ۔۔۔۔۔ "

بڑی پاشا بات کاٹ کر ناگواری سے بولیں "ابا کہتے بکواسی ہیں جی تمے ۔ چپ کے چپٹ پٹ لگا دیئیں ۔ میں جو جو پوچھوں، بس اُتتے کا جواب دینا"

"بہت بہتر میری سرکار۔" بڑی بی بغیر بُرا مانے بولیں۔

"تمہارا خاندان کون سا ہے ہور تمہارے سسرال کا کون سا؟"

"جی سرکار، ہم لوگ نجیب الطرفین ۔۔۔ خاک چاٹ کر کہتی ہوں کہ ہمارا سلسلہ آل رسول، خاندانِ سادات سے ملتا ہے۔ میرا میکہ بھی سید تھا۔ سسرال بھی، خدا کی مہربانی سے بیٹیا کو بھی سسرال سید گھرانہ ہی ملا۔ تین سیڑھی اوپر تین سیڑھی نیچے تک ہمارے خاندان میں کہیں کھوٹ نہیں ۔۔۔ نوکری کی، مزدوری کی، چاکری کی، لیکن شکر اس مالک کا اور کرم اس رسول کا کہ کبھی کسی کی دی خیرات نہیں لی۔ نہ صدقہ کھایا نہ زکواۃ لی ۔۔۔ دو ہاتھ پاؤں چلا کر ہی پیٹ بھرا سرکار ۔۔۔ جس کے لئے خدا اور اس کے رسول نے بھی کوئی ممانعت نہیں فرمائی ہے۔"

ٹھیک ہے ۔۔۔ ہم نا بھی تم کو نوکری کے واسطے اِچ بلا بھیجیں، ہمارے پوتے کو یا پوتی کو ۔۔۔ جو بھی اللہ دیا سو ۔۔۔ تمہاری چھوکری سال بھر دودھ پلانا مگر اپنے بچے کو اوپر کا دودھ پلانا کتے۔

"جی ۔۔۔؟ پہلی بار لڑکی بغیر مخاطب کئے، خود سے بول پڑی

"چپکی رہو زینب ۔۔۔ بڑوں کے بیچ میں زبان نہیں ہلایا کرتے۔" ماں نے بیٹی کو گھُرکی دی اور وہ وہیں سہم گئی۔

بڑی پاشا نے سنانا شروع کیا ۔۔۔ " پانچ روپے مہینہ تنخواہ، کھانا پینا ہمارا طرف۔ صبح اِچ صبح بڑا گلاس بھر کو بادام، زعفران، اور گڑ ملا ہوا دودھ۔ ہمارے

وہاں زچہ کو ٹھنڈی رہتی بول کو شکر نئیں دیتے۔ پھر دو گھنٹے سے ناشتہ ـــ دو انڈے پراٹھے، چوزے کا شوربہ، ـــ پھر کھانے سے پہلے بھوک دوک لگی تو طشتری بھر کو میوے، مکھانے، تلا ہوا گوند، بادام، کشمش، دوپہر کے کھانے پو روز ایک مرغی بکرے کا شوربہ، روغنی روٹی، ـــ چاول ہمیں زچہ اور اناکو نئیں دیتے۔ ٹھنڈے ہوتے بول کو ـــ چاہئے ایسی بھینس کا دودھ جس کو ہے لوگاں خاص زچہ کے واسطے پالتے کی ـــ سوائے میوے اور تھوڑی سرکی کے اس کو کچھ نئیں کھلاتے ـــ رات کو بچے کا دودھ ہضم ہوئے نہ ہوئے کر کے بہت ہلکی غذا ہے دیتے۔ بس پرندوں کا بہت گلا ہوا گوشت دلیئے میں پکا کو ـــ اور رات کو سوتے وخت وہی دودھ ـــ "

بڑی بی اور زینب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گیئں۔ کوشش کرتیں تب بھی شائد ہی ملک بند ہو پاتی۔

" اتا سوب اس واسطے کی ہمارا بچہ طاخت ور ہونا ـــ اور ایک بات یہ کی برتناں ہے سوب چاندی کے استعمال کرتے۔ حکیم صاحب بولتے چاندی میں بہوت طاخت رہتی ـــ ہور کپڑے بھی بھیج دیں گے۔ روز صبح تلی ہور صندل کے تیل سے مالش کر کے ایک خاتمہ نہلا یئں گی ـــ تب بچہ گود میں لینا۔ غلیظ عورتاں ہم نئیں رکھتے ـــ

" بہت بہتر میری سرکار ـــ" بڑی بی مارے ممنونیت کے دہری ہو کر بولیں " سب ٹھیک ہو جائے گا سرکار ـــ" وہ ادھ مری سی زینب کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔ اس کا بھی یہ پہلا بچہ ہے سرکار ـــ پہلے تو اچھی خاصی تندرست تھی لیکن کیا کہیں سرکار ـــ پیٹ کا بچہ کیا کچھ نہیں مانگتا ـــ پھر بھی شکر ہے

اس مالک کا سرکار، جس نے یہ زندگی دی ــ"

بڑی پاشا نے قدرے ناگواری سے انھیں دیکھا۔ "تمہاری زبان کتنی چلتی جی ــ ذرا تو چپ کرو ــ" وہ مغلانی بوا سے مخاطب ہوگئیں ــ" دیکھو وہ ہن پاشا کے محل سے ملا ہوا جو کمرہ ہے کی نیئں وہ اناّ کے واسطے خالی کرادیو ــ"

ایک دم زینب ننگے فرش پہ لوٹ گئی۔ ننھی بچیوں کی طرح پاؤں ٹپک ٹپک کر وہ چیخنے چلانے لگی "میں اپنے بچے کا دودھ کسی دوسرے بچے کو نہیں پلاؤں گی۔ نہیں پلاؤں گی ــ نہیں پلاؤں گی ۔ اماں مجھ پہ یہ ظلم نہ کرو۔"

چاندی کے طشت میں میوے ملے دودھ کے گلاس، مرغ، بکرے ــ پرندوں کے گوشت سے بنے ہوئے لذیذ قورمے، روغنی روٹیاں۔ پراٹھے ــ ایک ایک کر کے اس کی نگاہوں کے سامنے اُترنے لگے۔ وہ اسی طرح تھکی تھکائی ننگے فرش پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ چیخی تھی۔ نہ چلائی تھی پتہ نہیں اس کے دل کے کن گوشوں سے چیخیں بلند ہوئی تھیں ــ زبان تو خاموش ہی تھی۔

سجے سجائے کمرے میں جہاں سازوسامان ایسا تھا جیسے کسی شاہزادی کا کمرہ ہو ــ زینب دم بخود کھڑی تھی ــــ سفید مسہری ریشمی جالی سے مڑھی ہوئی ــ شفاّف چادر، تکیئے اتنے نرم کر جیسے اندر پھول بھرے ہوں ــ موٹا گدا ــ پائینتی پر نفاست سے تہہ کی ہوئی کشمیری شال ــ انگاروں کی طرح گرم، مگر پروں کی سی ہلکی ــ نیچے فرش پہ قالین۔ ایک طرف آئینہ، سنگار میز۔ بڑی مسہری سے ہٹ کر چھوٹی سی مسہری ــ اسی نفاست اور اہتمام سے جیسے کسی شہزادے کے لئے ہو ــ !

"کس خوش نصیب کے لئے ہے یہ؟ زینب نے دکھے دل سے سوچا۔
تھوڑی دیر میں ایک خادمہ درزن کو لئے آموجود ہوئی

" بی بی اپنا ناپ دلوا دیو، تمہارے واسطے کپڑے تیار ہونا ہیں، تے
جب تک یہاں رہیں گے یہاں کے اچ کپڑے پہننا پڑیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ کسی معمول کی طرح ہر بات سنتی اور کرتی گئی۔

جب کمرہ سب لوگوں سے خالی ہوگیا تو بڑی بی نے اطمینان کی سانس
لی ۔ "خدا کا شکر ہے بٹیا، بڑی سرکار نے تمہارے شوہر کے بارے میں
کوئی سوال نہ کیا۔"

"اگر انھیں پتہ چل جاتا کہ تم بیوہ ہو تو ممکن ہے وہ اسے بُرا شگون سمجھتیں
کہ ہمارے بچے کو ایسی عورت دودھ پلا رہی ہے جس کا شوہر ہی نہیں تو تمہارے
نصیب ایسے نہ چمک پاتے۔"

" زینب پھوٹ پھوٹ کر رو دی ۔ "اماں یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ اسے
نصیب کا چمکنا کہتے ہیں، میں ماں ہو کر اپنے بچے کو دودھ نہ پلا سکوں اس سے
بڑی نصیب کی تاریکی کوئی اور ہو سکتی ہے اماں؟"

" بٹیا ۔ کئی بدنصیب بچے تو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی ماؤں کو
ایک سرے سے دودھ اُترتا ہی نہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے پیدا ہوتے
ہی ان کی مائیں مرجاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہارے ساتھ ایسی کوئی مجبوری
نہیں۔ اتنا کھاؤ گی تو اللہ بھر پور ندیوں جیسا دودھ بھی نہیں دے گا۔ کہ اس بچے
کو پلا کر تھوڑا بہت اپنے بچے کو بھی پلا سکو۔ تم دل کیوں چھوٹا کرتی ہو؟

"اماں دل ہے ہی کس کمبخت کے پاس جو چھوٹا یا بڑا ہو!"

جس سیلاب کو بڑی بی اتنی دیر سے روک رہی تھیں۔ جیسے پھوٹ پڑا ـــ ایک دم انھوں نے زینب کو سینے سے لگالیا۔ آنسوؤں نے ان کی گویائی چھین سی لی۔ "آج تمہارا شوہر ہوتا تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اس کی غیرت تو ایک حماہ بھی نہ سہار سکی ـــ تمہارے ابا نے بس یہی تو کہا تھا کہ اللہ ایسیوں کو اولاد دیتا ہی کیوں ہے جو اسے پال بھی نہیں سکتے۔ غریبی بُری تو ہوتی ہے بٹیا مگر ایسا بھی کیا کہ اپنی جان ہی لے ڈالی۔ ہم نے بھی تو اک عمر اسی غربت میں کاٹ دی کہ صبح کھایا تو شام کی آس نہیں۔ شام ملا تو صبح کا یقین نہیں۔ آج وہ ہوتا تو دیکھتا کہ خدا کتنا بڑا ہے جہاں فاقے مرنے کی نوبت تھی وہاں شاہی نعمتیں! ایسی کہ انسان جن کا تصور بھی نہ کر سکے۔ پھر اوپر سے پانچ روپے ماہانہ ـــ تمہاری تو زندگی ہی سنور گئی بٹیا۔"

"ٹھیک کہتی ہو اماں، میری تو زندگی ہی سنور گئی ـــ" وہ آنسوؤں سے بھری، دکھ سے بھاری آواز میں بولی ـــ "کیا دنیا میں کھانا ہی سب کچھ ہوتا ہے؟"

بڑی بی نے آنسوؤں سے چمکتی آنکھوں سے بیٹی کو دیکھا اور بالوں کو جھلا کر بولیں: "بٹیا، ایک زمانہ ان بالوں پر سے ہو کر گزرا ہے۔ تب ہی یہ سفید ہوئے ہیں۔ اور اس زمانے نے یہی بتایا کہ سب سے بڑا دکھ بھوک ہے۔ سب سے بڑی خرابی بھوک ہے۔ سارا جھگڑا بھوک کا ہے بٹیا، بھوک نہ ہوتی تو خدا کو کون پوچھتا؟"

اُسی دم مغلانی بوا کمرے کا پردہ اُٹھا کر داخل ہوئیں اور زینب کو سمجھا کر بولیں: "دیکھو بی بی ـــ زچگی کے بعد سال بھر تک، جب تک بچہ دودھ پیئے گا تمہارے شوہر یہاں نہیں آنا ـــ" پھر وہ بڑی بی کو دیکھ کر ذرا مسکرائیں ـــ "اب تم بڈھے بڑے ہو تم کو کھول کو سمجھانے کی تو ضرورت نہیں نا؟"

دوسرا دن زینب کے لئے بڑا عجیب ثابت ہوا۔ پہلے ایک دائی اماں آئیں جو اُسے ٹٹول ٹٹول کر کہہ گئیں کہ دو دن بھی مشکل سے نکلیں گے، پھر ایک کرسچین لیڈی ڈاکٹر آدھمکی، جس نے ہر قسم کے معائنے کئے اور شوہر، ماں، باپ سے لے کر سب ہی تک کی صحت کے بارے میں پوچھ گچھ کر ڈالی ۔۔ بہت ساری گولیاں اور پینے کی دوائیں اس کی سرہانے والی میز پر جمع ہو گئیں۔ یہ سب کچھ اس کے لئے بڑا عجیب و غریب تجربہ تھا ۔۔ اس کے یہاں تو سب سے بڑا ڈاکٹر حکیم جو کچھ تھا وہ اوپر ہی والا تھا زچگی تک کے لئے ڈاکٹر نے بہت ہلکی غذائیں زیادہ تر دودھ اور پھلوں کے رس تجویز کئے

لیکن اس سارے معاملے میں، ان پڑھ دائی ماں زیادہ تجربہ کار ثابت ہوئیں اس لئے کہ اسے ڈیوڑھی میں آئے تیسرا ہی دن تھا کہ شام ہوتے ہوتے وہ ایک ننھے منّے سے لڑکے کی ماں بن گئی ۔ چوبیس گھنٹے گزرنے پر اس نے وہ زندگی بخش تناؤ اور درد اپنے سینے میں محسوس کیا جو پکار پکار کر کہتا ہے "میں ان داتا ہوں، مجھ سے کچھ مانگو۔

معاملہ بڑی پاشا کے دربار میں گیا۔ وہ بولیں " ٹھیک ہے ابھی تو دلہن پاشا کی زچگی کیا معلوم کب ہوئے۔ جب دودھ کا زور ہو رہا تو بچے کا منہ لگا دیو۔"

وہ سارا ہفتہ زینب نے جنّت یا جنت سے بڑھ کر اعلیٰ، حسین اور خواب آگیں ماحول میں گزارا ۔۔ ایسی غذا جو شائد بے حد نیک روحوں کو جنت میں عطا کی جاتی ہوگی، کام نہ دھام، ننھا ننھا سا گول مٹول بیٹا پہلو میں ۔ دو پاکیزہ نہریں اپنی شدت سے جاری ہو گئیں ۔۔۔ زینب کا جی چاہتا کہ اپنے بیٹے کو لے کر کہیں دور بھاگ نکلے، ۔۔۔ اس طرح کہ کوئی نہ دیکھے، کوئی پیچھا نہ کرے ۔ بس وہ ہو اور اس کی ماں کا پھول ۔ لیکن مستقبل اپنا بھیانک منہ پھاڑے آکھڑا

ہوتا ـــ غریب باپ جو آنہ دو آنہ روز پر کانگر (جولاہے) کا کام کرتے ـ بوڑھی ماں جو اکثر روزے رکھ رکھ کر فاقوں کی تہمت مٹاتیں ـــ کس قدر خوش تھے کہ ان کی بٹیا کو تو اللہ نے عیش کرا دئے اور پانچ روپے ماہانہ ان کی اپنی گزر اوقات کے لئے بھی مقرر کر دیا ـــ بھلے سے وہ اپنے گھر چلی بھی جائے مگر آبا کی نہ کے برابر آمدنی کیا سُکھ دے پائے گی ـ ؟

نوکری وہ کرنے سے رہی ـ آبا اماں نے کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں اور پھر بچے والی کو ماما گیری پر رکھتے لوگ کتنا بدکتے ہیں ـ ہر طرف اندھیر ہے ـ وہ ساری فکروں سے نجات پانے کے لئے اپنے لال کو کلیجے سے لگا لیتی

آٹھویں دن ڈیوڑھی میں وہ ہنگامہ بپا ہوا کہ سب اپنا آپا بھول گئے ـــ لیڈی ڈاکٹر کی اس نقار خانے میں بھلا کون سنتا ؟ ڈھول تاشے، گاجے باجے، ڈومنیاں، میراثنیاں زچگیوں کے گیت ـ جاپوں کے گیت، خیر خیرات پکوان تلن، ایک شادی کی دھوم دھام تھی ـ بڑے سرکار اور بڑی پاشا کی خوشی کا اندازہ نہ تھا ـ اللہ تعالیٰ نے انھیں پوتے سے نواز دیا تھا ـ اس دن پہلی بار زینب نے چھوٹے سرکار اور دلہن پاشا کو دیکھا ـــ چاند سورج کی جگمگاتی جوڑی ـــ ڈیوڑھی میں چھوٹے سرکار کے بارے میں متضاد رائے تھیں ـــ چند چھوکریاں کہتی تھیں "دلہن پاشا کے دیولنے ہیں اُنوں ـ" اور چند بتاتی تھیں "خوب دکھاوا ہے ـ جب موقع ملے تاک جھانک کر لیتیں ـ" مگر جس والہانہ انداز سے اپنی بیگم پر جھکے ایک ساتھ بیٹھے اور بیوی کو دیکھ رہے تھے اس انداز نے زینب کے دل سے ہر خدشہ دور کر دیا ـ

ـ رات گئے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی زینب جب دولہن پاشا کی تجر

لینے ان کے محل میں پہنچی تو انھوں نے بڑے دوستانہ انداز میں اس سے شکایت کی "اب تم ہمارا بابا چھین لیں گے نا انا ؟"

زینب پر سے، اس کے دل پر سے اس کے ہوش و حواس پر سے کئی آندھیاں سنسناتی گزر گئیں۔ کتنی ہی دیر وہ یوں ہی کھڑی رہی پھر اپنی ساری قوت گویائی جمع کر کے بولی "خدا آپ کا سہاگ، آپ کی ممتا سلامت رکھے بی بی، میں ایسا سوچوں بھی تو جل جاؤں۔" وہ رونے پر آگئی۔

"ایو رو و مت انا۔ نئیں تو بابا کا دودھ سوکھ جائیں گا۔" دلہن پاشا لہجے میں ممتا بھر کر بولیں۔

زینب نے سر اٹھا کر پوچھا "کس نے کس کا بچہ چھینا ہے بی بی۔ سوچ کر جواب دیجئے گا۔" مگر یہ بات اس نے کہی کب تھی اس کی زبان تو خاموش تھی۔

چھوٹے پاشا جو چاند پاشا کے نام سے پکارے گئے۔ جب چوبیس گھنٹے گھنٹے کے ہو گئے تو دودھ سے لگا دئے گئے۔ انا کا بچہ جو دس دن میں ماں کے دودھ کا عادی ہو گیا تھا کسی طرح دودھ چوسنی یا نپل کو منہ نہ لگاتا تھا۔ چاند پاشا چسر چسر دودھ پی رہے تھے اور انا بار بار پلٹ پلٹ کر دیکھتی کہ اس رونے کی آواز سے میرے کان بہرے ہو گئے ہوتے تو اچھا تھا۔ پرلے صحن سے بڑی پاشا کی محبت سے بوجھل آواز آئی "اگے انا تمہارے بچے کو کسی چھوکری کے پاس دے کو باورچی خانے میں بھجا دیئی۔ چاند پاشا کو چین سے دودھ پلاؤ۔ نئیں تو اس کے رونے کی آواز سن سن کر تمہارا دودھ سوکھ جائیں گا۔" متواتر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے اور گولیاں کھلانے سے بھی لیڈی ڈاکٹر

کو پھر بُلوایا گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے خوشامد بھری جھاڑ پلائی۔ "بے بی ہم تم کو گرم پانی کی بوتل سے سینکائی کرنے کو بولا۔ یہ ٹھنڈا پانی کی پٹیاں کون رکھا۔؟"

دلہن پاشا کا چہرہ درد ضبط کرنے سے واقعی کھنچا کھنچا سا تھا۔ جھلا کر بولیں: "معلوم نئیں ڈاکٹر یہ لوگاں کیا کیا کرلے رئیں — آپ پلیز۔ میرے کو انجکشن دیو یا کچھ بھی مگر میری تکلیف کم کر دیو۔

"مگر بے بی —" ڈاکٹر پیار سے بولی۔" تھوڑا دن بابا کو دودھ پلانے میں کیا حرج ہے۔؟"

انگریز گورنس سے پڑھی ہوئی "بے بی" بہت دلار سے ٹھنک کر بولیں "اوہ نو ڈاکٹر، سارا فیگر خراب ہو جاتا۔ میں نہیں فیڈ کرتا۔"

انّا پر ایک خادمہ مامور کی گئی، جس کا کام صرف یہ تھا کہ کڑی نگرانی کرتی رہے کہ انا کہیں اپنے بچّے کو دودھ نہ پلائے۔ انّا کا بچہ جب بہت بلبلا بلبلا کر روتا تو اس کے منہ میں چوسنی دے دی جاتی جیسے چوستے چوستے اس کے جبڑے پچک گئے۔ ڈبے کا دودھ کبھی اسے ہضم ہوتا کبھی نہ ہوتا۔ گول مٹول بچہ ہڈیوں کی مالا ہو کر رہ گیا۔ دن رات نوکر خانے سے اس کے رونے کی آواز آتی رہتی اور انّا کی اپنی گود میں، اور کبھی مسہری میں بڑی پاشا کا پوتا گہری نیند سوتا رہتا۔ ایسی نیند جو پیٹ بھر کھانے کے بعد ہی آتی ہے۔

رات گئے جب سب گہری نیند میں ہوتے تو انّا چپکے سے اپنے بچے کو اٹھا لاتی۔ اسے بھینچ بھینچ کر پیار کرتی۔ سینے سے لگاتی۔ مگر وہ جس کا سلسلہ

آل رسول، خاندانِ سادات سے ملتا تھا۔ کبھی یہ سوچ تک نہ سکی کہ اپنے
ہی گوشت پوست کے ٹکڑے کو، اپنے ہی بچے کو اک ذرا سا اپنا دودھ پلا
دے ــــ نمک حرامی کے بارے میں وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ کیونکہ اسے تو زندگی
بھر اسی ڈیوڑھی کے آقاؤں کا نمک کھانا تھا ــ بڑی پاشا اس کا مستقبل
محفوظ کر چکی تھیں۔ وہ اسے اطمینان دلا چکی تھیں کہ ایک بار جو اس ڈیوڑھی
میں آ گیا سو آ گیا ــ بچے کا دودھ چھڑانے کے بعد بھی اناؤں کو برخاست نہیں
کیا جاتا تھا ــــ یہ اس ڈیوڑھی کے آقاؤں کی شان کے خلاف تھا۔ وہ جن
کی ڈیوڑھی کے دروازے اتنے اونچے تھے کہ ایک کے اوپر ایک کر کے تین اونٹ
کھڑے کر دیئے جاتے تو بھی آسانی سے پھاٹک سے گزر جاتے، وہ کیسے اتنی چھوٹی
سی بات سوچ سکتے تھے کہ اپنا کام نکل جانے کے بعد کسی کو دھتکار دیا جائے؟

ہر مہینے ایک ڈاکٹر سب نوکروں کے معائنے کے لئے آتا تھا۔ اس بار آیا
تو اس نے انا کے بچے کو دیکھ کر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ دیوان صاحب سے
کہنے لگا ــ " اس بچے کی حالت اچھی نہیں ہے۔ "

بچے کے ہاتھ پاؤں سوکھ گئے تھے۔ پیٹ نکل آیا تھا۔ انسان کا بچہ تھا
مگر کچھ عجیب مکوڑے کا سا ڈول ہو گیا تھا ــــ بڑی پاشا تک یہ خبر گئی تو وہ
ہولا کر بولیں ــ " اگے ڈاکٹر سے بولو، اس کا اچھا علاج کرو کبھی مر مرا گیا تو غم کے
مارے انا کا دودھ سوکھ جائیں گا۔ اور چاند پاشا کی صحت خراب ہو جائیں گی "

مگر ڈاکٹر نے کہہ دیا " بہت دیر ہو چکی ہے اس کے سوکھے کا مرض لاعلاج
ہو چکا ہے۔ ماں کا دودھ ملے تو شائد کچھ ہو سکے۔ "

کسی دوسری عورت کا دودھ اسے دینے کی کوشش کی گئی تو اس نے

منہ تک نہ لگایا۔ اس لئے کر ان سارے مہینوں میں عورت کے نرم گرم اور زندگی بخش سینے کی پہچان تک سے محروم ہو گیا تھا۔

ادھر اُدھر ہاتھ مار کر اس نے اپنی چوسنی تلاش کی اور منہ سے لگالی۔

ڈاکٹر کے معائنے کے ٹھیک ساتویں دن، دوپہر کے ۱۲ بجے انّا کا بچّہ اپنے بستر میں مرا ہوا پایا گیا۔ بڑی دیر سے وہ خاموش تھا۔ ورنہ اس کی ریں ریں جاری ہی رہتی تھی خادمہ نے ڈبے کے دودھ سے بھری شیشی اس کے منہ سے لگانی چاہی تو اسے اکڑا پڑا پایا۔

" انّا — انّا — " خادمہ زینب کے پاس پہنچ کر بے حد گھبرائی ہوئی آواز سے دھیرے سے بولی، " تمہارا بچّہ — "

" کیا ہوا میرے بچّے کو ؟ زینب نے بے تابی سے پوچھا۔

وہ رُک کر جھجک کر بولی " شائد مر گیا — "

زینب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ نہ روئی نہ سسکی۔

جب انّا کا دوپہر کا کھانا لگا۔ اس وقت تک پوری ڈیوڑھی میں انّا کے بچّے کی موت کی خبر پھیل چکی تھی۔ کھانا لگنے کی اطلاع سن کر حسب معمول بڑی سرکار نے آکر دستر خوان کا معائنہ کیا۔ مرغ، بکرے کا شوربہ، روغنی روٹی قورمہ، پانی کے بجائے دودھ سب ٹھیک تھا۔ وہ روزانہ ہر چیز کا جائزہ لیتی تھیں کہ ایسا نہ ہو کھانے میں کمی رہ جائے اور چاند پاشا کے دودھ پر اس کا برا اثر پڑے۔ دستر خوان کا جائزہ لے کر انھوں نے روز کی طرح آواز دی۔ " انّا چلو کھانا کھالو، پھر بچّے کو بھی دودھ پلانا ہے۔ " زینب ایک معمول کی طرح اُٹھی، ہاتھ دھوئے اور دستر خوان کے کنارے بیٹھ کر مقوی کھانا کھانے لگی — کہ بچّے کا دودھ نہ سوکھ جائے۔

نولکھا ہار

"پچھلی رات کو "رت جگا" تھا اور اب اسی لئے سارے میں سوتا پڑا ہوا تھا بیبیاں باندیاں سب پاؤں پسارے، کھلے ڈھکے سے بے خبر ساں ساں سوئی پڑی تھیں۔ بس، ایک دلہن پاشا کی آنکھیں تھیں کہ نیند سے دشمنی مول لئے بیٹھی تھیں بیچ دالان میں چھالیہ کترتی کوئی بابی نوکرانیوں پر چلّائیں۔ "اگے چھنالاں۔ کب تک سوئیں گیاں۔ رات کو مہندی سانچق آنے والی ہے کہ نہیں۔ دو بجے، والوں کے استقبال کی کوئی فکر چ نہیں مال زادیوں کو۔" اور وہ کھٹا کھٹ سروتا چلانے لگیں۔

سونے والیوں میں ذرا بھی تو ہلچل پیدا نہ ہوئی دلہن پاشا نے نرم سی آواز میں پوچھا۔ "مغلانی اماں، بی بی تارا کے دو بچوں پہ پوچھا تو ٹھنک گیا نا؟"

"وہ تو ٹنک گیا پاشا، پن یہ پوتیاں اٹھیں گے تو ہور بھی ہزار کاماں کرنے کو پڑے، سو وہ تو مرکو گیاں۔" وہ ذرا رک کر بولیں۔ "پن پاشا آپ تو ذرہ بھی نیند نئیں لئے ایسے سے صحت خراب ہوجا ئیں گی۔ آپ جاکو ذرا تو آرام کرلیو۔"

دلہن پاشا چپ ہی رہیں تو مغلانی اماں ذرا دکھ بھرے لہجے میں بولیں۔ "ہو ماں۔ بیٹی بیاہنا بھی کوئی معمولی کام تو ہے نئیں۔ اُجاڑ دل کیسا بھاری ہوجاتا کی پہاڑ بن جاتا۔ بیاہ ہے سو مصیبت، نئیں بیاہ ہے سو مصیبت۔"

دلہن پاشا اک کرب ناک سی ہنسی ہنسیں۔ "نئیں مغلانی اماں میری صحت کو کچھ بھی نئیں ہونے والا۔ میں اچھا خاصا تو سوئی۔ پوری نیند لے کو اُٹھی ہوں۔"

پوری نیند۔؟ اس سفید جھوٹ پر انھیں خود ہنسی آگئی۔ ان کی نیند تو آج سے نہیں اس گھڑی سے ہی ان سے روٹھ گئی تھی جس رات وہ بیاہ کر اس وسیع و عریض حویلی میں آئی تھیں۔ کیسی جگمگاتی رات تھی وہ بھی، یہاں سے وہاں تک چراغاں ہی چراغاں۔ پہلی بیٹی اور اکلوتی بیٹی۔ بیٹے تو تین تین تھے۔ اصل ارمان اور ٹھاٹ باٹ تو بیٹی ہی کی شادی میں ابا حضور کو نکالنے تھے۔ رات کو دن بنتے تو بہتوں کی شادیوں میں دیکھا ہو گا۔ مگر دلہن پاشا کی شادی میں رات جو دن بنی تو کئی ہفتے تک دن ہی دن بنی رہی۔ نہ جہیز کا کوئی حساب تھا نہ اوپری دین لین کا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ ایک بیٹی کی شادی میں بڑے نواب نے اتنا اٹھایا کہ حیدر آباد کی ساری بیٹیوں کی شادی کی جا سکتی تھی۔ اور داماد بھی کیا چن کر ڈھونڈا تھا کہ دیکھو تو بس دیکھتے رہ جاؤ۔ سر پر دستار کلاہ، جامے دار کی جھم جھماتی شیروانی اور رول دار اطلس کا جھم جھماتا پینڈلیوں

پر کسا ہوا پاجامہ پہنے، سر سے ٹخنوں تک جھولتا سہرا باندھے جب وہ دلہن کو گود میں اُٹھانے آئے ہیں تو ساری محفل ہکا بکا رہ گئی، جیسے کسی کلی کو اٹھا رہے ہوں، ایسی ہی آسانی سے انہوں نے دلہن پاشا کو گود میں اُٹھا لیا۔ کسی میراثن نے سپٹے کی بات سنائی "اے بی، مرد اور پان تو کرارے ہی اچھے لگتے ہیں۔ دیکھو تو کیا مزے سے کوٹے میں بھر لیا۔"

مگر وہ ایک ہی رات کی بات تھی جب دولہا میاں نے اپنی نئی نویلی دلہن کو کوٹھے میں بھرا ہوگا۔ نصیبوں کا حال اوپر والے کو معلوم، دلہن پاشا جن کا اصل نام اشرفی بانو تھا۔ اشرفی یوں کہلائیں کہ بچپن میں سونے کی طرح دمکتی تھیں پیار سے ماں باپ نے، اشرفی اشرفی پکارا تو نام ہی اشرفی پڑ گیا۔ جوانی آئی تو کندن بن بیٹھیں۔ سنہرا سبزا رنگ، حیدرآباد کی عام لڑکیوں کی طرح، بلکہ اس سے بھی سوا لمبے گھنیرے بال۔ جھلمل کٹوروں کی طرح بادامی آنکھیں۔ بھلے کو کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا کہ حویلی کی ریت ہی یہ تھی کہ لڑکیاں نگاہیں نیچی رکھیں ورنہ جس طرف نظر اٹھتی کشتوں کے پشتے لگ جاتے اور اوپر سے قوسوں اور محرابوں کی رعنائیاں کیا قیامت تھی کہ ہے ہے! پھر حویلی کا ایک جان لیوا چلن یہ تھا کہ لڑکیاں ان دنوں اندر، کرتوں کے اندر محرم وحرم کچھ بھی نہیں پہنا کرتی تھیں — جو ہے بس سامنے ہی ہے — ایسی آنچیں دیتی جوانی کہ سردیوں کی ایک رات لڑکیوں کو یاد ہی رہ گئی۔ جب مار سردی پڑ رہی تھی اور نوکر خانے سے گل بدن نے انگیٹھی لانے میں دیر کردی تو سب لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر کہا تھا۔ "اللہ اب سردی کا کیا رونا ہے جی۔ اپنے اشرفی کی طرف ہاتھاں کر کو آگ تاپ لیو — سو سب لوگاں گرم ہو جائیں گے۔

ایسی انگیٹھی بدل جاتی تھی اور حشر یہ ہوا کہ جہیز میں پیش بندھی جو دی گئی وہ جنوب کے اضلاع کی تازہ تازہ رکھی گئی ایک مار پٹا خہ لمباڑن، یعنی بنجارن چھوکری تھی۔ ایسی تو کئی جہیز میں دی گئی تھیں لیکن ہم عمری کے ناطے اصل کام دھام کی خاطر وہ لمباڑن ہی اصل پیش بندھی مانی جاتی۔ اپنی تیز طرار اور چلبلی طبیعت کی وجہ سے اشرفی بانو کو وہ بہت پسند بھی تھی۔ لیکن یہ کیسے خبر تھی کہ اس کی تیزی ان کے اپنے نصیب کو ہی اس تیزی سے چاٹ جائے گی۔

شادی کی رات — پہلی رات، سہاگ رات گزار کر جب دولہے پاشا اپنے شہزادوں ایسے شان دار کمرے سے نکل کر جب باغ میں آئے تو دیکھا کہ خوب دھما چوکڑی شور مچ رہا ہے۔ ایک لمباڑن ہاتھ لیے کر کر کے مالی سے وہ مچیٹے لے رہی ہے کہ مالی سات بچوں کا باپ ہو کر بھی نامردوں کا سردار نظر آرہا ہے۔

"اے چھوکری، اتنا شور کیوں مچا رہی ہے۔"

دولہے پاشا نے الجھ کر اسے مخاطب کیا۔ جس کی ان کی طرف پیٹھ تھی۔

"اے چھوکری" سنتے ہی اس نے تنک کر سر گھمایا اور اس کے سر گھماتے ہی ادھر دولہے پاشا خود گھوم کر رہ گئے — ایسی آفت ڈھاتی جوانی تو ان کے باپ نے بھی اپنے خوابوں میں نہ دیکھی ہوگی۔ چہرہ تھا کہ انگارہ بنا ہوا تھا۔ آنکھیں آگ برساتی ہوئی۔ اتنی موٹی چوٹی ٹھیک سینے کے بیچ میں چاندی کے بٹنوں کے اوپر پڑی ہوئی اور چوٹی کے ایک طرف اُدھر اور ایک طرف اِدھر۔ بس اب کیا کہا جائے .... بڑے غصّے سے اس نے کہا "میں چھوکری دکھتی ہوں۔؟"

اب دولہے پاشا کی مردانگی بھی خوشی خوشی جاگ پڑی۔ ذرا شرارت

بولے ۔" دکھتی تو چھوکری ہی ہے ۔ مرد لوگاں ایسے پہاڑیاں اٹھا کر نہیں گھوما کرتے
انھوں نے صاف اس کی جوانی پر چوٹ کی،

" میرے کو میرے نام سے پکارنا سرکار، ہاں بول دی میں! "

" مگر آپ کا اسم شریف؟ " دولہے پاشا ہنسی روک کر بولے ۔

" بگیا " اس نے اسی بے اعتنائی سے جواب دیا۔

' بگیا ۔ ! بہت اچھے ۔ واقعی پھولاں ہی پھولاں ہیں یہاں سے وہاں تک "
پھولوں کے ذکر پر بے چارہ مالی شامت اعمال سے دخل انداز ہوگیا " دیکھئے
سرکاریں بہی اچ بول را تھا کی یہاں سے وہاں تک پھولاں ہی پھولاں ہیں ۔ ہور
آپ کا حکم ہے کی پھولاں توڑا نیئیں کرو ۔ اپنے آپ سے مرجھا کو، ٹوٹ کو گرگئے
تو گرنے دیو ۔ پن یہ کیا بولتی کی میں اپنی بی بی صاب کے واسطے توڑ دل پچ توڑ دوں
گی ۔ ہور کیا بولتی ..... "

ایک دم اس قیامت نے حقارت آمیز لہجے میں دھتکارا، " اگے
تو جاکو اپنی بی بی کے لہنگے میں سو جانا رے ۔ چُپ کا چپ ٹرٹر لگا کو رکھا ت
جا جا، بہوت دیکھے تیرے جیسے پھولاں سنبھالنے والے۔ "
پھولاں سنبھالنے والے تو ہم ہیں بگیا بیگم' دولہے پاشا کے دل سے آواز نکلی
اللہ معلوم اس بگیا میں کیا زہر بھرا تھا کہ آپ تو ویسے ہی بھری بھری کسی
کسی رہی، مگر دولہے پاشا کو چوس چوس کر بھوک بنا ڈالا ۔ کسی کام کے نہ رہ گئے ۔۔
یا تو وہ ایسے کرارے تھے کہ پہلی رات کو دلہن کو کلی سمجھ کر اٹھا لیا تھا یا اب پانی کا
گلاس بھی اُٹھاتے تو ہاتھ تھر تھر کانپنے لگتا ۔

دلہن پاشا کے حصے میں کیا آیا ۔۔ بس بھڑکتی، انگارے بھاتی جوانی ۔

-اور شادی کی اکلوتی ایک رات کی یادگار، ایک بچّی — پھر میاں نے انھیں کبھی بھولے بسرے بھی ہاتھ تک نہ لگایا ۔ یوں ہاتھ لگانے یوگ وہ بھی کہاں گئے تھے ۔ دلہن پاشا چودہ برس کی بیاہی سسرال آئیں ۔ نویں مہینے ایک گڑیا سی بچّی کی ماں بن گئیں پندرہ برس کی ننھی منی ماں، اپنی ہی بچّی سے یوں کھیلتیں جیسے ماں باپ کی سب سے بڑی اولاد اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلے۔ کھاتے پیتے گھرانے کے بچّے تو ویسے بھی جلد ہی جوانی کی منزلوں کو جا چھوتے ہیں۔ پھر دلہن پاشا کی تو ساری زندگی ہی ان کی اپنی بیٹیا بی بی تارا تھی ۔ اس کو بنانا سنوارنا سجانا، اپنے ہاتھوں کھلانا پلانا، ماماؤں اور نوکرانیوں کی پلٹن ہونے کے باوجود اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں کرنا ۔ ہردم ان کا یہی تو مشغلہ تھا ۔

بی بی تارا کچھ ہی عرصے میں ماں کی بہن لگنے لگیں ۔ دس گیارہ برس کی ہونے کے بعد تو وہ ماں کے جہیز کے کپڑے بھی پہننے لگیں۔ کیوں کہ ہاتھ پیر خوب نکل آئے تھے اس قدر کم فرق ماں بیٹی میں نظر آتا کہ دادی حضور نے شروع ہی سے ماں کو بجائے امی حضور کے آپا کہنا سکھایا تھا۔ اب برسات کے دنوں میں کبھی جھولے پڑتے تو بی بی تارا ماں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی آنگن میں لے جاتیں۔ جھولے پر بٹھا دیتیں۔ ہاتھوں میں ہاتھ دے کر پھگڑی کھیلتیں ۔ آگے پیچھے بھاگ کر آنکھ مچولی، چھیپتا باتی، لپّا چھپی کھیلتیں، دیکھنے والے کہتے: "اوئی، ایسا لگتا جیسا دونوں بہناں بہناں ۔" اور ادھر چند برس سے تو بی بی تارا باقاعدہ بڑی بہن لگتی اور ماں چھوٹی بہن ،

بی بی تارا کو گھر کے کام کاج سکھائے گئے، اسکول میں پڑھایا گیا۔ نوابوں کی حد تک جتنے بھی سینے پرونے، مہمان داری، اور گھر یلو زندگی کے کام کاج

ہوتے ہیں ۔ وہ تو نوکرانیاں نپٹا لیتیں ہیں، مگر بی بی تارا نے اپنے اتھڑپن کے باوجود دوستی میں بہت کچھ سیکھ ہی لیا ۔ سولہ برس کی شہد ٹپکتی عمر میں جب پیغام اس لئے ٹوٹ ٹوٹ برسنے لگے، کہ اکلوتی ایک بٹیا کو تو نواب دولت یار جنگ ایک زمانہ سمیٹ کر دے دیں گے ۔ تو دلہن پاشا کا دل دھڑ سے ہو کر رہ گیا ۔ میری گڑیا مجھ سے چھن جائے گی، میرا کھلونا مجھ سے بچھڑ جائے گا ۔ نیند تو مقدر میں تھی ہی نہیں اب تو بالکل اکھڑ کر رہ گئی ۔

شادی کی رات تھی، اور یہ دن ۔ ایسی غیرت مند بی بی تھیں کہ پھر کبھی تو شوہر سے پہل کر کے بات نہ کی، بستر کے قابل تو رہے ہی نہیں تھے ۔ بات چیت بھی اگر وہ کر لیتے تو بس جواب دے دیتیں ۔ یہ کبھی نہ ہوا کہ اپنی طرف سے انھوں نے بات میں پہل کی ہو ۔ لیکن غموں کا مارا کھایا ہوا ۔ ماں کا تڑپتا دل لے کر وہ اس دن پہلی بار ان کے پاس گئیں اور کہا: " آپ باپ ہیں ۔ جو بھی کریں گے میرے کو منظور ہے ۔ مگر خدا کا واسطہ دیتیوں کی بی بی تارا کو گھر داماد دیو ۔ "

" گھر داماد مل جائیں گا ۔ ؟ " نواب صاحب ذرا شک بھرے لہجے میں بولے ۔

" کیوں نئیں ملیں گا ۔ آپ اِتی بے حساب دولت دیں گے تو کوئی بھی گھر دامادی قبول کرلے سکتا ۔ " وہ ایک دم رو پڑیں ۔ " میں اب پرانی باتاں نکالنا نئیں چاہتی، مگر ایچ بات بولتیوں کی میں اپنی بچی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی ۔ "

شائد زندگی بھر کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا بس ایک آسان ذریعہ، نواب صاحب کو نظر آیا ۔ محبت سے کہنے لگے ۔ " تم جو چاہتے ہو، جیسا بولتے ویسا ہی انشاء اللہ ہوئیں گا ۔

بی بی تارا یوں بیٹھی تھی ۔ ہر طرف شادی کے ہنگاموں کی دھوم تھی ۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ۔ یہاں سے لے کر وہاں تک ایک طوفان سا پھیلا ہوا تھا اب دلہن پاشا کی نیند کا ہے سے اُڑ گئی تھی ۔ بیٹی گھر کی گھر ہی میں تو رہنے والی تھی نا ۔ اب تو یہ ساری ہلچل یوں مچی ہوئی تھی کہ پچھلی رات کو جو رت جگا ہوا تھا اس نے ان کی سوئی ہوئی جوانی کو دھکے مار مار کر پھر جگا دیا تھا ۔

رات کو وہ تو اپنے کمرے میں ہی تھیں، مگر خاندان بھر کی بیاہی، اَن بیاہی لڑکیاں، عورتیں، خواصیں، مامائیں، نوکرانیاں، دالان میں ہلڑ بازی مچائے ہوئے تھیں ۔ شاہ آبادی پتھروں والے فرش پر سے جاجم اور چاندنی اٹھا کر وہیں انگیٹھیاں اور چولہے جلا دیئے گئے تھے ۔ اور دھنا دن پکوان پک رہے تھے ۔ گلگلے چونگے، میوے کی پوریاں، ملیدے، ۔۔ ایک طوفان تھا ۔ یہ سارا پکوان شادی کے گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ توشے کے طور پر دیا جاتا تھا ۔ اس وقت پکوان ہو رہے تھے اور مذاق کے مذاق ۔ ادھر میراثنیں کیا کسی سے کم تھیں ۔ ایک سے ایک فحش ڈھلتے گائے جا رہے تھے ۔

اُجاڑ مارا گلا تڑخ گیا گاتے گاتے ۔" ایک میراثن تنک کر بولی ۔" اب میری جگہ کسی اور کو لیو ۔ اور میرے کو ذرا آرام دیو ۔"

" اچھا چلو۔" ایک کنیز شرارت سے بولی ۔۔ اب ذرا پہیلیاں بوجھیں گے گتے ۔"

" اچھا تو بول میں بوجھیتوں ۔" دوسری بولی

ایک خالہ زاد بولیں ۔" اچھا جو پہیلی بوجھ کو نہ دے وہ میری باندی بنے "

تیسری بولی" ۔ برابر یہ بجھو دیتی ہیں ۔ میرے کو بہت مسئلے اور پہیلیاں

یاد ہیں۔"

"اچھّا تو شروع ——— بسم اللہ۔"

"ایک تھال موتیوں سے بھرا

سب کے سر پہ اوندھا دھرا

چاروں اور وہ تھال پھرے

موتی اس سے ایک نہ گرے

سب چلّانے لگیں ۔" ایوّ اللہ، اتّا آسان، یہ تو آسمان اور تارے ہیں"

"برابر ——— اچھا اب دوسرا بولیتوں ۔ ذرا غور سے سننا۔" ایک ہنس کر بولی۔

چٹاخ پٹاخ کب سے	ہاتھ پکڑا جب سے
آہ اوئی کب سے	آدھا گیا جب سے
چُپ چاپ کب سے	سارا گیا جب سے

اِک دم ہنسی کے ٹھٹھے اُبلنے لگے، اور پہیلی بولنے والی گُدگدیاں پڑنے لگیں ۔ مگر وہ تنک کر کہنے لگی، " اگے تمہارے دماغاں گندے ہیں اُجاڑ ماریو ۔ یہ تو امیر خسرو کی پہیلی ہے ۔ اس کا جواب ہے" کنگن : اب سوچ بھلا"

"اچھا ایک ہور بوجھو: "

بات کی بات ٹھٹھولی کی ٹھٹھولی

مرد کی گانٹھ عورت نے کھولی

بی بی تارا، جو سہیلیوں کے بیچ میں ہنستی مسکراتی، شرمائی لجائی بیٹھی تھی، دھیرے سے بولی " قفل چابی ۔"

دو ایک لڑکیوں نے اس کے دھم کے جڑے ۔" بڑی چتری ہے وہ تو
تو میں بھی سمجھ گئی تھی۔
" اچھا ایک پہیلی بولتیوں اب؟ ایک طرار سی نوکرانی نے کہا۔" جو یہ
پہیلی نہیں بوجھا، اُنے میرا ذکر۔"
"ہاں، بول بول" سب لڑکیاں چلائیں۔
" سوتے سوتے ہاتھ میں لے کو سوئے ۔"
" حرام زادی ——— تیرا دماغ تو بالکل اچ ولیا ہے۔"
دہی نوکرانی ہنس کریں" اچھا ایک ہور بولتیوں " دونوں کا ایک اچ
جواب ہے ۔ سوچ کو بولو۔
" اسلتا مسلتا، ہاتھ میں لیو تو پھسل پھسل پڑتا۔"
پھر بی بی تارا ہی بولی " پنکھا ——— دونوں کا جواب پنکھا اِچ ہے ۔"
اب سب نے سوچنا شروع کیا ۔" اے سچّی تو بات ہے ۔ سوتے وقت ہاتھ
میں پنکھا لے کو سوتے نا گرمی کے دناں میں ——— ہور ہاتھ میں پسینہ آتا تو اُچاڑ مارا
پھسل پھسل بھی تو پڑتا نا۔"
"اب میری پہیلی جو نئیں بوجھے تو اس کو میرے سامنے سو اٹھک بیٹھک
کرنا پڑے گا۔" حویلی کی مغلانی اماں کی بیاہی بیٹی نے کہا۔
" ہاں بولو ۔"
" اوڑوں مروڑوں، تھوک لگا کو اندر گھسیڑوں ۔"
سب گالوں پہ ہاتھ ٹکا ٹکا کر سوچنے لگیں اتنے میں ایک لڑکی بھاگ گئی بھاگ
گئی اور ہاتھ میں کچھ لئے واپس آئی ۔۔ زور سے چلّا کر اس نے اعلان کیا " سوئی اندر دھاگا"

سب اس کی جان پہ ٹوٹ پڑیں ۔ اگے دیکھو، یہ سب یہاں نہیں چلنے والا ۔ کتاب میں سے دیکھ دیکھ کو مت بولو۔

لڑکی نے دونوں ہاتھ میں کتاب دبالی ۔" اچھا سچی بولیتوں، اب سے جھبٹا کھیل نئیں ۔ دل سے بولنا سب لوگ ۔ میں بھی ۔"

"اگے دلہن بیگم ۔ تم نا بھی تو کچھ مونہہ کھولو ۔"

دو چار سہیلیاں بی بی تارا کو خوب گدگدانے لگیں۔

وہ بل کھا کر ہانپ کر بولیں ۔ ایا، خدا کے واسطے اتّا گدگدی مت کرو۔ مرجاؤں گی ۔ اچھا، بس ایکچ بول کے میری باری ختم ۔ آں ۔"

پھر وہ ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر، مسکرا مسکرا کر بولنے لگی۔

"تو جاتا تھا میں پکارتی تھی
تو ڈالتا میں روتی تھی
پھر تو دیکھتا تھا، میں ہنستی تھی۔"

ایک نرم طوفان کی طرح چکراتی، بلبلاتی، آگ برساتی، دلہن پاشا اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں ۔" یہ کیا فضول باتاں لگائے بیٹھے تم لوگاں ۔ کچھ عقل ہے کو نئیں کہ اتنے بیٹھنے والیاں میں کنوارے بچیاں بھی ہیں ۔"

بی بی تارا اپنی جگہ سہم سی گئی ۔ "آپا، ہم تو خالی چوڑیاں اور چوڑی والے کا مسئلہ بولے۔"

دوسری ڈر کر اپنے ہاتھوں میں چھپائی ہوئی کتاب آگے بڑھا کر کہنے لگی۔ دیکھ لیجئے یہ تو ہم کتاب میں سے یاد کرے ۔"

دلہن پاشا نے اُتھل پتھل مچاتے سانس کو بڑی مشکل سے سینے میں سمیٹا

اور کتاب زور سے جھپٹ کر اپنے بستر پر آ گریں۔ کتاب کو تیزی سے کھول کر پڑھنا شروع کیا ۔" چند دکھنی پہیلیاں" کے عنوان سے الہ آباد کے کسی محمد نعیم الرحمان ایم اے نے کتاب مرتب کی تھی ۔ جو اس وقت ان کے جلتے بدن پر گرم تیل بن کر ٹپک رہی تھی ۔ انھوں نے چرچر کر کے پوری کتاب پھاڑ کر رکھ دی تھی ۔

پھر وہ نہ سو سکیں ۔ ایک ایک کر کے پورے سولہ برس کی زندگی کے دن ان کے سامنے آ آ کر اپنی اپنی شکائتیں کرنے لگے ۔

ایک دن بولا، یاد ہے، ایک دن برسات میں خوب پانی برسا تھا ۔ خوب بجلیاں چمکیں تھیں ۔ تم آنگن میں اتری تھیں تو پورا لباس پانی میں بھیگ کر سارے انگ ایسے بدن سے چپک گیا تھا ۔ تمہیں کتنی سردی لگ رہی تھی یاد ہے نا ۔! ایسی سردی کیا کمبلوں اور مخملیں رضائیوں سے جاتی ہے ؟"

ایک اور دن نے کہا " نواب دولت یار جنگ نے تو ایک رات کے بعد کبھی اس انگیٹھی ایسے جسم کو چھوا تک نہیں پھر تم نے اپنے آپ پر یہ ظلم کیوں روا رکھا کہ حویلی میں کتنے لڑکے تمہاری ایک چشم کرم کے منتظر رہتے تھے ۔ مگر تم نے انھیں پوچھا تک نہیں ۔ یاد ہے ایک دن شوکت نواب نے تمہارے دوپٹے کا، آنچل اک ذرا تھام لیا تھا تو تم نے کتنی زور سے ان کے تھپڑ مارا تھا ۔ کیا جنت میں جلنے کی آرزو اتنی شدید ہے ؟"

ایک اور دن بولا " ایک موٹر زندگی بھر اسی لئے وقف رہی کہ منوں برف کی سلیں لائے اور تم ٹب میں وہ برف گھول گھول کر یخ بستہ پانی سے نہا نہا کر اپنے جسم کی تپش ٹھنڈی کرتی رہو ۔ مگر کیا یہ روح کی گرمی برف سے بجھ جاتی ہے ؟

یاد ہے ایک دن .....۔"

ایک دن !

ایک دن !!

ایک دن !!!

انھوں نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ کتنے دنوں کو یاد کروں اور کتنے دنوں کو بھولوں ۔ اب میں اپنی بیٹی وداع کررئی ہوں، میں اکتیس بتیس کی سہی دیکھنے میں جوان سہی۔ میرے ارماناں پیاسے سہی ۔ میرے آرزواں تشنہ سہی پر میں اب سب بھول جانا چاہتی ۔ میں اپنی بیٹی کی بڑی بہن دکھتی۔ یہ بھی صحیح ہے کوئی بھی ہم دونوں کو آج تک ماں بیٹی نہیں بولا۔ جو بولا بہناں، بہناں اچ بولا۔ پھر بھی میں اب ایک داماد کی ساس بننے جارئی ۔۔ انھوں نے چیخ کران دیکھی قوتوں کو جیسے بھگانے کی کوشش کی ۔ !

"چلے جاؤ میرے سامنے سے نکل جاؤ ۔ یہ پلید خیالاں دراصل شیطاناں ہیں ۔ مالک میرے کو آج تک سنبھالا، اب بھی سنبھال لے ۔"

اور وہ ہانپتی، ہانپتی کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

رت جگے کی رات گئی ۔ پھر مہندی کی رات بھی گئی۔ سانچق کی رات بھی گئی ۔ اور آج شادی کی رات، یعنی جلوے کی رات تھی ۔ حویلی میں وہ بھگدڑ مچی ہوئی تھی کہ منٹ کے کام کو خواہ مخواہ گھنٹہ لگ رہا تھا۔ بیٹی بیاہ کر میکے ہی میں رہنے والی تھی مگر کیونکہ گھر داماد میسّر آگیا تھا۔ داماد میں ہر خوبی موجود تھی، بس ذرا عمر کا فرق تھا، تو بھئی دودھ دینے والی بھینس کی دولاتیں تو کھانی ہی پڑتی ہیں ۔ پڑھا لکھا ہونہار نواب خاندان کا لڑکا تھا۔ عمر چھتیس سال تھی کچھ لوگوں نے منہ بھی بناے ۔

لگے کوئی بات بھی ہو۔ بوئی اجاڑ یہ بچی دیکھو سو سولہ برس کی ، اور دولہا دیکھو سو پوری دگنی عمر کا ـــــ ایسا کیا کال پڑا تھا کیا چھوکروں کا۔

" اب آپا ، ایک نہ ایک جگہ تو جھکنا ہی پڑتا نا ماں - دیکھو سب چیز تو برابر ہے۔ بس عمر ہی ذرا زیادہ ہے ـــــ اس سے کیا فرق پڑ جائیں گا بھلا ـــ ؟"

" فرق کی بات تو جانے دیو ـــ جوڑ کو جوڑ تو سجنا چاہیئے نا۔"

" وہ تو سجیں گا ـــ نئیں تو ایک دو بچوں کے بعد عورت خالہ اماں نئیں تو پھوپی اماں لگنے لگ جاتی مرد کی۔ اچھا چ ہے مرد ٹے سنے ذرا بڑی عمر کا چ ہونا۔"

لیکن جب رفعت نواب بڑے کھانے کو آئے تو سب اپنی جگہ سن رہ گئے ایسا جی دار مرد ، ایسا بانکا سجیلا جوان ، ـــ کلین شیو - نہ داڑھی نہ مونچھ۔ گورا رنگ اونچا قد ، مضبوط ہاتھ پاؤں ، چوڑی چکلی چھاتی ۔ مسکراتا چہرہ ، شریر آنکھیں ـــ صورت سے مشکل سے پچیس چھبیس سال کا لڑکا ، سب اپنی معقول اور نامعقول رائیں دل ہی دل میں دبا کر بیٹھ گئے۔ واقعی اچھا جوڑ ملا تھا۔ بی بی تارا تھی تو سولہ سال کی۔ مگر عمر اس سے کچھ زیادہ ہی لگتی - اور یہ زیادہ ہو کر کم لگتے۔ یوں بھی عمر صورتوں ہی سے پرکھی جاتی ہے۔ کوئی اسکولوں میں سرٹیفکٹ تھوڑی ڈھونڈنے جاتے ہیں۔

برات جس دھوم دھڑکے سے آئی اس کا ذکر فضول ہے۔ اس لئے کہ ادھر سے گھر داماد ، ـــــ ماں باپ نے جی کھول کر جو دیا ، دولہا والوں نے بھی کوئی کسر چھوڑی اور جہیزوں کو تو جانے دو صرف ایک ہار ہی پورے نو لاکھ کا تھا۔ اب کسی کو یقین آئے یا نہ آئے یہ پرانے نوابوں کا دستور رہا ہے کہ ایک نہ ایک خاندانی زیور ان کے یہاں پشتہا پشت سے چلا آتا ہے۔ جو خاندان کی ہر بڑی بہو کو چڑھایا جاتا ہے ـــــ

سورنعت نواب کا خاندانی نولکھا ہار تھا جو پرانے وقتوں کے نولاکھ روپئے کا تھا یقیناً اب اس کی قیمت دگنی تگنی ہوگی مگر نام وہی چلا آرہا تھا "نولکھا ہار"۔

عقد خوانی ہوگئی ـــــ باہر بینڈ باجہ اور اندر ڈھولک پٹنے لگی ـــ یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ نکاح خوانی ہوگئی اور بیٹی پرائی ہوگئی - اب اندر آرسی مصحف یعنی جلوے کا ہنگامہ ہونا تھا۔ جس کے بعد ہی دولہا میاں اپنی دولہن پر قابض ہو سکتے تھے۔ قاعدہ ہے کہ جلوے سے پہلے دلہن کو نئے سرے سے سجایا سنوارا جاتا ہے۔ کیونکہ ایجاب قبول کرانے کے لئے جب وکیل اور ماموں دلہن کے پاس "ہاں" کہلوانے آتے ہیں تو دلہن کچھ تو میکہ چھوڑنے کے غم میں سچ مچ اور دنیا دکھاوے کو اس سے بھی زیادہ، رہ رہ کر اپنے آپ کو ہلکان اور بدحال کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آرسی مصحف کے وقت جب زندگی میں پہلی بار آئینے میں دولہا میاں کو اس کا دیدار کرایا جاتا ہے۔ اس رخ روشن کا دلکش نظر بہت ضروری ہوتا ہے جو بعد میں تخیل زندگی بھر دیکھا ہوتا ہے

سسرال سے آیا ہوا جوڑا بی بی تارا کو پہنایا جا چکا تھا ـــ اس قدر وزنی کمخواب کا جوڑا کہ بی بی تارا اپنے وزن سے دگنی ہوگئیں، پھر زیور پھر بھر داں جوڑا، پھر حیدرآبادی نگوں کا جوڑا، پھر پہنچیاں، پھر کرن پھول، پھر ماتھے کا جھومر، پھر مانگ کا ٹیکا ـــ بس بے چاری دلہن بوجھ کے مارے زمین کی طرف جھکی چلی آرہی تھی - اور ابھی ایک قیامت تو باقی ہی تھی، ابھی تو دولہا میاں منہ دکھائی میں وہ بیش قیمت وزنی "نولکھا ہار" بھی اس کے گلے میں پہنانے والے تھے۔

جلوے کا وقت قریب آرہا تھا۔ بڑے سے چاندی سونے کے پلوان چھپر کھٹ پر جہیز میں دیا جاتے والا شاندار مخملیں بستر بچھا دیا گیا، زریں مسند زربفت کا ڈ تکیئے، گدگدے لحاف ـــ بی بی تارا کو سنبھال کر بہت سی لڑکیاں

چھپر کھٹ تک لائیں اور گڑیا کی طرح بٹھا دیا۔ برابر میں دلہن پاشا کو بیٹھنا پڑا۔ وہ لاکھ شرمائیں لاکھ بہانے بنائے مگر بہنوں، نندوں، بھاوجوں، نے پکڑ دھکڑ کر انھیں چھپر کھٹ پر چڑھا دیا —— اب مونہہ دکھائی کے جو بے حساب روپیے اور زیور ملتے انھیں کون سنبھالتا پھرتا۔ ؟

دولہا میاں کے آتے ہی جیسے قیامت آگئی۔ میراثنوں نے اینڈی، بینڈی آوازوں میں وداعی کے گیت گانے شروع کر دیئے۔ جنھیں سن کر لڑکیوں بالیوں نے رونے کی بجائے ہنسنا شروع کر دیا۔ بھلا ایسے رومانٹک موقع پر کہ پہلی بار اپنی دولہن کا چاند سا چہرہ دیکھنے کے لئے دولہا آیا ہے۔ رونا دھونا کس کو سوجھتا ہے۔ تنگ آکر میراثنوں نے گانا بند کر دیا۔

دولہا میاں کو چھپر کھٹ پر ٹھیک دولہن کے سامنے بٹھایا گیا۔ دولہن کے برابر میں دلہن کی ماں براجمان تھیں۔ کسی میراثن نے پتہ نہیں کس رو میں اس ہلڑ میں ایک بات کہہ دی، جو کسی اور نے سنی نہ سنی دولہا میاں نے ضرور سُن لی،

"اِیّو، دلہن پاشا کو دیکھو، اُنو خوداچ دلہن لگ لے رئیں۔"

داماد نے اب ذرا غور سے ساس کو دیکھا۔ انھوں نے اپنی ساس کو سولہ برس پہلے چاہے نہ دیکھا ہو۔ مگر تھیں تو وہی —— چاول بھر بھی تو نہیں بدلی تھیں سنہرا سنہرا رنگ۔ حیدرآباد کی عام لڑکیوں کی طرح، بلکہ ان سے بھی سوا لمبے گھنیرے بال، جھلمل کٹوروں کی طرح بادامی آنکھیں —— اور اوپر سے قوسوں اور محرابوں کی رعنائیاں —— کیا قیامت تھی کہ ہے ہے! پھر حویلی کا ایک جان لیوا چلن یہ تھا کہ لڑکیاں ان دنوں بھی اندر کرتوں کے اندر محرم وحرم کچھ بھی نہیں پہنتی تھیں۔ جو ہے بس سامنے ہی ہے۔ ایسی آنچ دیتی جوانی کہ سردیوں کی اس شام کو بھی جب ہزاروں

لوگوں کا ہجوم تھا۔ اسی ایک انگیٹھی کی بدولت سارا ماحول گرما گرم محسوس ہو رہا تھا انھوں نے بڑی شریر نگاہوں سے ساس کو دیکھا۔ روایت اور قاعدے کے مطابق بر دکھاوے کو داماد آتا ہے تو ساسیں پردہ کرتی ہیں۔ اس لئے اس دن وہ اپنی ساس کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ آج دیکھا تو بس دیکھے ہی جا رہے تھے۔ دلہن پاشا نے گھبرا کر نگاہیں جھکالیں ـــ حویلی کی ریت ہی یہ تھی کہ لڑکیاں نگاہیں نیچی رکھیں۔ ورنہ کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔

اب آئینہ لایا گیا ـــ سونے کے چوکھٹے میں جڑا آئینہ جس میں پہلی بار دولہا میاں اپنی دولہن کا منہ دیکھ کر اسے نولکھا ہار پہنانے والے تھے۔ چاند سی صورت نظر آئی تو دولہا میاں نہال ہو اٹھے ـــ انھوں نے خواب میں سوچا اور دیکھا ہو، تو دیکھا ہو زندگی میں تو ہرگز نہیں سوچا تھا کہ ایسی حسین اور پیاری دلہن انھیں مل بھی سکتی ہے۔ مگر وہ سچ مچ مل چکی تھی، اور اب وہ اس پیاری صورت کی قیمت ایک نولکھے ہار سے ادا کرنے جا ہی رہے تھے کہ کسی نے ذرا ترس بھری آواز میں کہا "ائیّ ماں، اتنا وزنی ہار بچاری بچی کے گلے میں نکّو ماں ابھی سے۔"

"بعد میں چپ رسم ادائی کو ڈال دینا بولو ـ ابھی پہلے اچ بہت وزن ڈال کے کو بیٹھی اُنے ـ" یہ سسرال والیوں میں سے کوئی تھیں۔

ہار دولہا میاں کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا ـ "پھر اس کا کیا کروں میں؟" وہ کچھ جھولین اور شرارت سے بولے: "اگے تمہاری ساس کے پاس رکھوا دیو جی میاں ـ بعد میں لے لینا ـ نئیں تو ان کے گلے میں ڈال دیو ـ"

دلہن پاشا نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ مگر اتنے میں ذرا آگے جھک کر مسکراتے مسکراتے دولہا میاں ان کے گلے میں نولکھا ہار پہنا چکے تھے اور اپنی قسمت

کو رو چکے تھے، کیونکہ جب ہار کو قبولیت کا درجہ بخشنے کے لئے دلہن پاشا ذرا آگے کو جھکیں تو گہرے اودے رنگ کے ریشمی کرتے کے اندر کچھ ایسا تباہ کن منظر نظر آیا کہ انھوں نے سوچا کہ ایٹم بم یا تو ہیروشیما پر گرا تھا یا آج مجھ غریب پر گرا ہے ہیروشیما پر تو بے شمار بم گرے ہوں گے۔ مگر یہاں تو دو ہی بموں نے زندگی تباہ و تاراج کر دی۔ کیوں کہ اس حویلی میں ایک جان لیوا چلن یہ تھا کہ لڑکیاں اندر ــــ کرتوں کے اندر محرم وحرم کچھ بھی نہیں پہنا کرتی تھیں۔ بس جو ہے سامنے ہے۔ اور ویسے بھی سچی بات تو یہ ہے کہ کس کر باندھ رکھنے کی ضرورت تو انھیں پڑے جن کا گوشت لٹکا چلا آرہا ہو۔ یہاں تو جیسے تلواریں ہوں ــ یہ معاملہ تھا تو محرم پہنے ان کی جوتی اب سلامی اور منہ دکھائی کا دور چلنا شروع ہوا۔

"اس کی طرف سے سونے کے کنگن دلہن کو۔"

"اس کی طرف سے پانچ اشرفی دولہا پاشا کو۔"

"اس نے گلے کی تن منی دی۔"

"اس نے دولہا میاں کو گھڑی دیا ــــ"

ارے کاہے کی سلامی اور کاہے کی منہ دکھائی۔ وہاں تو ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ اب وہ مر مر کر اپنا دھیان ٹہلانے کی سوچ رہے ہیں کہ یہ جو ہماری دلہن کی ننّی ہیں ان کا دوپٹہ کتّا اچھا اودا اودا ہے۔ اس پر کا مدانی کتّی اچھی الگ ہی ہے۔ مگر کامدانی پہنے ہوئے دوپٹے کو چھوتا بولے تو کتنی مصیبت کی بات ہے۔ چھونے والیوں کے انگوٹھے ضرور چھل گئے ہوں گے ــــ پھر اچانک وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو گالیاں دینے لگے۔

"ارے جناب یہ فضول باتاں مت سوچیئے جو سوچنا ہے وہی سوچتے نا

اب اگر وہ دوپٹہ چننے والی مر بھی جائے تو آپ کا کیا بگاڑ کر جائیں گی ۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آپ صرف ایک ہی بات سوچنا چاہ رہے ہیں ۔ اور خود کو اُلّو بنانے دوسری طرف دھیان لگا رہے ہیں ۔۔۔ مگر میاں آپ ہیں اصلی اُلّو کے پٹھے ۔۔ آپ کو کا مدانی کے دوپٹے اور کرتے سے مطلب ؟"

کرتے کا دھیان آتے ہی ان کے ذہن میں پھر قینچی سی چلنے لگی ،۔۔۔ اب دنیا میں رنگوں کی کچھ کمی ہے کیا ۔۔ سنہر رنگ ہی لے لو ۔ سنترے کے چھلکے جیسا کتنا اچھا لگتا ہے ۔ یا ہرا رنگ ، پتوں کے جیسا ۔ پھر ایک جامنی رنگ بھی ہوتا ہے گلابی رنگ ہوتا ہے ۔۔۔ اور کمبخت یہ لال رنگ کدھر مر گیا تھا آج ؟ یہ کرتا اور کچھ نہیں اور کچھ نہیں ۔ اودے رنگ کا ہی ہونا تھا ۔ ؟ اودا رنگ اور ذرا جھک کر دیکھو تو اس کے اندر تباہیاں ، بربادیاں ۔ !"

ان کے باہر جتنا شور تھا ، اندر اس سے بھی کہیں زیادہ غلغلہ مچ رہا تھا اچانک دولہن یا شاگری اور حبس کے مارے بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں ۔

" بھئی اللہ میں ذرا اپنے کمرے کو جا رئی لیوں ۔۔ "

ان کے کھڑے ہوتے ہی جیسے کائنات کا سارا سلسلہ اپنی جگہ جامد ہو کر رہ گیا ۔

" بیگم صاحبہ آپ کا کیا بگڑ جاتا جو آج آپ یہ جان لیوا ردل دار اطلس کا پھنسا پھنسا پاجامہ نہ پہن نہ لیتے ۔ ؟"

سادگی اور وہ بھی ایسی قیامت خیز ۔۔ یہاں سے وہاں تک محفل میں چمکی ، سلمہ ، ستارے ، گوٹے ٹھپے ۔ اور زیوروں کی جگمگاہٹ تھی ، اور یہاں کیا تھا ؟ صرف ایک اودا کرتا ۔ اودا تنگ پاجامہ اور اُودا دوپٹہ بس یہاں وہاں

کا مدانی ضرور دمک رہی تھی ۔ دمک کیا رئی تھی دولہا میاں کے نصیبوں پر ہنس رہی تھی مگر وہ نولکھا ہار ـــــ؟ دو اونچے اونچے گنبدوں کے بیچ کیسا حقیر ہو کر رہ گیا تھا!

بارات کو واپس تو جانا تھا ہی نہیں کیونکہ داماد "گھر داماد" ملا تھا، اسی لئے گڑبڑ کے کم ہونے کے آثار نظر ہی نہ آتے تھے ۔ پتہ نہیں ایک بج گیا تھا یا دو بج گئے تھے، مگر یہاں تو نصیبوں نے ایک نہ دو پورے تین بجا دیئے تھے ۔ وہ اٹھ کر چلی بھی گئیں مگر دماغ پر وہی چھائی ہوئی تھیں ـــــ اب لاکھ دولہا میاں ادھر ادھر کی باتیں سوچنا چاہتے ہیں، مگر بعض مرد ایسے ہوتے ہیں کہ باغوں میں پھول، کھلنے کا سماں بھی یاد کرنا چاہیں تو کمبخت دماغ میں ہیروشیما پر بمباری کا منظر ہی یاد آتا ہے ۔

دلہن چھوٹی سی تھی، الھڑ سی تھی، نادان بھی تھی، اس لئے دلہن پاشا نے اپنے کمرے کے برابر کا ہی کمرہ اس کے لئے چنا تھا ـــ کیا پتہ رات بے رات، وقت بے وقت اسے ماں کی ضرورت پڑ جائے ۔

کھانے والے سے فارغ ہو کر حویلی میں رفتہ رفتہ سناٹا ہونے لگا۔ جا بجا فرشوں پر قالینوں پر جس کو جہاں جگہ ملی، پاؤں پسار کر سو گیا ـــــ کیا ذکر ابنا اور کیا بیبیاں، ـــــ بس اکا دکا بوڑھی عورتیں یہاں وہاں بلا ضرورت جوان، لڑکیوں کو تاڑتی جاگتی دکھائی دے رہی تھیں ـ باقی تو سارے میں سوتا پڑ گیا تھا ـــ البتہ دلہن کی سگی سہیلیاں ڈرائنگ روم میں گھیرا باندھے بے کار کی باتوں سے اس کا دماغ کھائے جا رہی تھیں۔ سسرال والیاں کھا پی کر رخصت ہو چکی تھیں اور دولہا میاں اپنے کمرے میں پہنچا دیئے گئے تھے ۔

دلہن پاشا کی نیند تو مدت ہوئے روٹھ چکی تھی، آج بھوک بھی اُڑ چکی تھی۔ اکیس برس کا بوجھ، جو وہ بہر حال اُٹھائے چلی آرہی تھیں، آج اچانک ناقابل برداشت سا ہو گیا تھا۔ دماغ میں، دل میں بس ایک دھڑ کا دھک ہوئے جارہی تھی۔ انھوں نے اپنے بے پناہ بال، جن میں آج کے دن تک ایک بھی مہربان کرن نہیں چمکی تھی۔ جو ان کے نصیبوں ہی کی طرح کالے تھے۔ وہی بے پناہ بال کھول کر بکھرا دیئے کہ سر ذرا ہلکا محسوس ہو۔ صبح صنوبر نے عود اور عنبر انگاروں پر ڈال کر، ان کا سر ٹوکری پر رکھوا کر بال خوشبو سے بسائے تھے۔ بید کی ٹوکری کو تکیہ بنا کر لیٹ کر وہ بچپن سے اپنے بال اسی طرح سکھانے اور خوشبو سے بسانے کی عادی تھیں۔ اب خوشبوؤں میں بسنے کا ارمان تو کیسے رہ گیا تھا۔ ہاں کبھی کبھار نہا کر جلد بال سکھانے ہوتے کہ ابر کے مارے سردی وغیرہ نہ ہو جائے تو وہ ٹوکری سر کے نیچے لے لیتیں۔ آج بھی خوشبوؤں کا سمندر ان کے سر میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

چُنا ہوا۔ بنی بنا ہوا دوپٹہ انھوں نے اُتار کر سنگھے کے پاس رکھ دیا تھا۔ شور شرابے سے بچنے کی خاطر انھوں نے دالان کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر لیا تھا۔ وہ دروازہ بھی بھڑا ہوا تھا، جو اُن کے اور بی تارا کے کمروں کو ملاتا تھا مگر اس کی چٹخنی نہیں لگی تھی۔

اچانک انھیں خیال آیا کہ دیکھ تو لیں۔ دلہن کے کمرے میں پاندان رکھوا دیا گیا ہے یا نہیں۔ ان کی اپنی زندگی میں بس ایک ہی دن سنہرا تھا۔ اور ایک ہی رات رنگین ــــ اور اس رنگین اور سنہرے خواب میں پاندان کا بڑا اہم رول تھا ــــ جب نواب صاحب نے پان مانگا تھا۔ اور انھوں نے اپنے حنائی ہاتھوں سے لرزتے کانپتے پان بنایا تھا۔ اور شرماتے شرماتے نواب صاحب کے سامنے رکھا تھا۔ تو انھوں نے

بڑی بدمعاشی سے کہا تھا" اونہوں ایسے نہیں ۔۔۔ اپنے ہاتھ سے کھلائیے ۔"
اور جب انھوں نے پان نواب صاحب کے مونہہ میں رکھنا چاہا تو وہ پورا ہاتھ ہی
چبا گئے ۔ بلکہ ہاتھ کیا ان کا پورا انگ انگ چبا گئے ۔۔۔ پھر بھی وہ رات کبھی نہ لوٹی
" اللہ نہ کرے کہ میری بیٹی کی زندگی سے وہ رات کبھی مونہہ موڑلے ! روز
وہ رات آئے میرے اللہ ۔" انھوں نے بوجھل دل سے سوچا اور بھڑے ہوئے
دروازے کو کھول کر برابر کے کمرے میں داخل ہو گئیں ۔

چھپر کھٹ سونے چاندی کا ملواں تھا ۔ اس پر سونے کے کام کی بنی مسند
تھی ، اور اس پر جو شخص بیٹھا موزے اتار رہا تھا ، وہ نہ سونے کا تھا اور نہ چاندی کا ۔
محض گوشت پوست کا ایک انسان تھا ۔ ایک جوان انسان ، ایک جوان مرد ،
دلہن پاشا گھبرا سی گئیں ۔ دوپٹہ تو وہیں ان کے سرہانے بتی بنا پڑا تھا
اور وہ یہاں اپنی ساری بلندیوں اور ساری خوبصورتیوں کے ساتھ ادھ ادوے
لباس میں کھڑی قیامتوں کو دعوت دے رہی تھیں ۔

عورت برہم ہے تو مرد کمزور پڑنے لگتا ہے لیکن گھبرائی ہوئی عورت کو دیکھ
کر ایک مرد کو اپنے مرد ہونے کا پوری شدت کے ساتھ احساس ہونے لگتا ہے ۔ اور یہی
وہ لمحہ ہوتا ہے جب گیہوں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ساری چیزوں میں سب سے زیادہ
لذیذ محسوس ہونے لگتا ہے ۔

دلہن پاشا کو کچھ کچھ یاد تھا ۔۔۔ سب کچھ نہیں ، کچھ ایسا کہ کسی نے شہد ٹپکاتی
آواز میں یہ کہا "آپ کے گلے میں نولکھا ہار کتنا خوبصورت لگتا ہے ۔" اور پھر انھیں
پھول کی پنکھڑی کی طرح ہلکا اور نازک سمجھ کر مخمل کے بستر پر بچھا دیا گیا ۔۔۔ اور پھر جیسے
زندگی بھر کی گھٹنوں کا ازالہ ہو گیا ۔۔۔ جیسے وہ سب خواب کی باتیں تھیں کہ برف

گھول گھول کر پانی کو ٹھنڈا کیا جا رہا ہے۔ وہ ٹھنڈے یخ بستہ پانی سے نہا رہی ہیں اور آگ اور گرمی ہے کہ کم ہوتی ہی نہیں ۔۔ یہ سب انھیں خواب اور جاگتے سوتے کی کیفیت لگی۔ لیکن جب صدیوں بعد انھیں ہوش آیا تو لگا کہ وقت تو جہاں کا تہاں پڑا ہوا ہے سامنے والا۔ بڑا گھنٹہ چار بجا رہا ہے ۔۔ اور وہ یعنی بنت حوّا آدم زادے کی پسلی سے لگی اسی لباس فاخرہ میں ملبوس ہیں جو قسام ازل نے اس دنیا میں بھجواتے وقت انھیں عطا کیا تھا۔

پاگلوں کی طرح وہ اٹھیں اور شیرنی کی طرح اس شخص پر ٹوٹ پڑیں جس نے اُن کی سولہ سال سے مقفّل عبادت گاہ کو تباہ و تاراج کر دیا تھا۔

"تم ۔۔ تم ۔ تم جنور ۔۔ تم حیوان، تم میری بچی کا سکھ اُجاڑنے والے ذلیل کتے، ! خدا تمہیں کبھی سکھ نہیں دیں گا۔ اللہ کرے تم کو کبھی کوئی خوشی نہ ملے ..."

اور وہاں اس مرد کا دل، ذہن، ہر احساس، صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا ۔ یہ عورت ۔۔ یہ عورت کس قدر گڑبڑا دینے والی شخصیت ہے۔ بستر پر جتنی خوبصورت لگی غصّے میں تو اس سے بھی سوا ہے۔ بس کیا کروں، چبا ڈالوں کچا کھا جاؤں ؟"

سارے دن دلہن پاشا اپنے کمرے سے نہ نکلیں۔ بی بی تارا کا کمرہ برابر میں ہی تو تھا۔ لڑکیاں، بالیاں، دلہن کی جان پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ بس ایک ہی سوال تھا "اری بتا نا گے رات کو کیا کیا ہوا ؟"

بی بی تارا جیسی بھولی بھالی ۔ اب اسے کیا پتہ کہ پہلی رات کو کچھ نہ کچھ ہونا ضروری ہوتا ہے ۔ وہ ہنس ہنس کر بات کو ٹالے گئی۔

عصر کے لگ بھگ دلہن پاشا اٹھیں۔ گناہ کا بوجھ انھیں اٹھنے ہی نہ دیتا

تھا۔ بوجھل دل، بوجھل ضمیر اور بوجھل پیروں سے چلتی غسل خانے گئیں۔ نہا کر زرد رنگ کا کرتا پاجامہ پہنا، دوپٹہ اوڑھا، عصر کی نماز پڑھی - اور ہر چند کہ عصر کی نماز کے بعد سجدے میں گرنے کی اسلام میں ممانعت ہے۔ لیکن وہ اپنے بوجھل اور گناہ گار دل کی مارے اتنی شرمندہ تھیں کہ سجدے میں گر کر ماتھا رگڑ رگڑ کر خوب روئیں۔ اتنا کہ جانماز کا اتنا حصہ آنسوؤں سے تر بتر ہو گیا۔ مگر ان کے دل کی بھڑاس نہ نکلی۔ بس ایک ہی دعا لب پہ آئے جاتی۔

" خدایا - مجھے معاف کر دے۔ مالک میں بہت بڑا گناہ کری - مجھے موت دے دے۔"

رات کے کھانے پر سب کا سامنا ہونا ضروری تھا - وہ باہر باہر آئیں تو داماد تو کیا سب دیکھتے ہی رہ گئے، ملکوتی حسن زرد رنگ کے جوڑے میں اور بھی دمک رہا تھا، سوگوار چہرہ ہزار بناؤ سنگھار والے چہروں سے بالاتر نظر آ رہا تھا۔

داماد نے سلام کیا، مگر انداز میں بے پناہ شرمندگی اور ندامت تھی ان کا جی چاہا، سلام کے جواب میں جوتا کھینچ ماریں مگر ساری دنیا دیکھ رہی تھی، اس لئے محض گردن خم کر کے اپنی بڑائی ظاہر کرنا چاہی۔ لیکن کسی نے دھیرے سے جیسے کان میں کہہ دیا ہو۔" وہ تم سے دو سال بڑا ہے۔" انھوں نے گھبرا کر سر اٹھایا اور ادھر پھر ایک مرد اپنے آپ کو مرد محسوس کرنے لگا لیکن انھوں نے خود کو سختی سے سمجھایا -" اونہوں - انے میرا داماد ہے۔"

دادی حضور سمجھیں، پتہ نہیں پوتی کے ساتھ دولہا میاں نے کیا

ادھم مستی بھی ہو، اس لئے نوکرانیوں سے کہہ دیا۔"آج رات بچی آرام کریں گی۔ ننھی سی جان کو روز روز یہ آفت نکو۔"

دولہا میاں کو یہ سندیسہ پہنچا دیا گیا کہ بیٹا آج گڑبڑ نکو۔ اکیلے اکیلے اچ سوؤ۔"

بارہ بجے۔ ایک بجا۔ پھر دو بجے۔ پھر ساتھ والے کمرے سے بتی بجھانے کی آواز آئی رات والی بتی شائد ابھی جل ہی رہی تھی کیونکہ دروازوں سے نیلی نیلی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔

پھر رات کا ایک اور پہر بیتا۔ باغ سے موگرے چنبلی کی سنکتی ہوائیں دستکوں پر دستکیں دینے لگیں۔ بی بی تارا دادی کی محفوظ باہوں میں سوئی پڑی تھی۔ سارا جگ ہی سویا پڑا تھا۔ صرف وہی جاگ رہی تھیں۔ لاکھ نہ چاہنے پر بھی ایک نہ ایک بیتی گھڑی یاد آ رہی تھی۔

سوچتے سوچتے دماغ بوجھل ہو گیا تو انھوں نے چوٹی کھول ڈالی کہ اس طرح دماغ کو اور سر کو بوجھ سے نجات ملے۔ بال بکھرتے ہی عود عنبر کی جان لیوا خوشبو سارے میں پھیل گئی۔

پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ دروازے تک پہنچیں اور ہلکے سے دھکا دیا۔ کوئی جیسے تاک ہی میں تھا۔

"آپ!" دولہا میاں قریب آکر حیرت اور خوشی سے بولے

وہ بے بس سی ہو کر بولیں۔" آج میں پھر نولکھا ہار پہنی ہوں۔"

سستا گوشت

"پان تو بنا کو دے دی، اب ہونٹاں میں ہونٹاں بھی دے دے۔"
بھولی نے سُنا، مگر یوں ہی احمقوں کی طرح کھڑی ان کا منہ دیکھتی رہی
"ہم کیا بول رئے، تو سنتی نئیں کیا چھوکری؟"
پھر بھی وہ نہ سمجھ سکی — یہ ٹھیک ہے کہ محل کے اندر داخل ہوتے ہوتے اس کی ماں نے کافی ہدایتیں اس کے کانوں میں انڈیل دی تھیں۔ جن کا خلاصہ کیا جا سکتا تھا تو بس یہی کہ نواب صاحب جو بھی کرنے کو بولے تو تو وہی اِچ کرنا —" لیکن وہ خصوصیت سے اس وقت بہت حیران تھی کہ "ہونٹوں میں ہونٹاں" کیونکر دے ویسے اس سے پہلے نواب صاحب اس سے جو بھی سوال کرتے رہے تھے۔ وہ بڑی ہی سعادت مندی سے ہر سوال کا جواب دیتی رہی تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے تو ایک کونے میں قالین سے ہٹ کر ننگے فرش پر سر جھکائے بیٹھی تھی انھوں نے اسے وہاں سے اُٹھ کر دیوان میں بیٹھنے کو کہا تھا۔ تو وہ جھجکی ضرور تھی۔

کہ ایسے خلیں گردوں والے دیوان پر کیوں کر جا چڑھے۔ لیکن "امی" نے کہہ دیا تھا۔ "نواب صاحب کا کہنا ٹالیں گی تو ٹانگاں پوٹا ننگا رکھ کو چیر دیوں گی۔" اس لئے وہ بڑی متانت سے ایک کونے میں سکڑی سمٹی سہمی جا بیٹھی تھی۔ پھر نواب صاحب نے قریب آکر، ذرا مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تھا "نام کیا ہے بی بی تمہارا؟"

بچپن سے اب تک تیرے میرے گھروں کے برتن بھانڈے دھوتے، جھاڑو بہارو کرتے اور چھنال بندوڑی، حرام زادی جیسے خطاب سنتے سنتے جس کا سارا وقت کٹا ہو، اچانک اپنے آپ کو "بی بی" جیسے خطاب کا اہل پا کر اس قدر خوش اور ساتھ ہی حیران سی رہ گئی کہ اسی لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اتنے اچھے نواب صاحب تو سچ جو بولیں تو وہی اچ کرنا۔ میرے جیسی غریب چھوکری کو بی بی بول رئیں، تو ضرور اُنوں بہت اچھے ہوئیں گے۔

اُسے خاموش دیکھ کر نواب صاحب نے اپنا سوال دہرایا تھا: "ہو بی بی، تم اپنا نام نہیں بتائے۔"

"جی — بھولی۔"

نواب صاحب پر ہنسی کا ایک دورہ سا پڑا۔ بڑا عجیب و غریب نام تھا کم سے کم اب تک تو ان کے کانوں سے ہو کر گزرا نہیں تھا۔ مگر اب جو انھوں نے غور سے دیکھا تو واقعی وہ انھیں اتنی بھولی نظر آئی کہ اس کے علاوہ اُس کا کوئی اور نام ہو ہی نہیں سکتا — ہونا بھی نہیں چاہیئے تھا۔

"کچھ پڑھی وڑھی ہے تو؟" انہیں پیار آیا تو "تم" سے فوراً "تو" پر اتر آئے۔

"ایسا چ معمولی سا" وہ ناک کو خفیف سا سکوڑ کر بولی۔ "بس خط پڑھے

لکھے جتنا ۔"

اپنے ماحول سے اسے مانوس کرانے کے لئے وہ خواہ مخواہ کی باتیں کئے گئے۔

"ہور کھانا پکانا آتا ؟"

"جی ہو ۔" وہ بڑی فرماں برداری سے بولی

"کیا کیا آتا ؟"

"جی ۔ ؟ دال، خشکہ، روٹی، سب، سالنے، املی کا کٹ، تلی کی چٹنی، ٹماٹے کا کھٹا ...." سب غریبانہ پکوان

نواب صاحب مزے لے لے کر سب سالنوں کے نام سنتے گئے۔ پھر بیچ میں بولے" ہور شامی کباباں، خورمہ، بریانی، پلاؤ، پسندے، قیمے کے پراٹھے یہ سوب نیئں آتا ۔ ؟

وہ بڑی حیرت سے اُن کے مونہہ کو دیکھ رہی تھی۔ جب وہ رُکے تو وہ ذرا اٹک کر بولی" مگر یہ سوب چیزاں تو گوش سے بنتے نا ؟

وہ ہنسے" ہاں گوشت سے تو بنتے ۔ مگر تیرے کو پکانے آتا تو ہوئیں گا نا ؟"

اب کے پہلی بار وہ ہنسی ۔ اور نواب صاحب کو ایسا لگا کہ اس کی معصوم اور دل کش ہنسی کی چھوٹ جو پڑی تو کمرہ جیسے اجالوں سے بھر گیا۔ وہ ہنستے ہنستے بولی" نباب صاب، ہمارے ہاں گوش نیئں آتا ۔ ہور جب گوش ہی نیئں آتا تو گوش کے پکوان کیسے آئیں گے ۔ ؟

"تو مطلب یہ کی تم لوگاں گوشت کھاتے ہی نیئں ۔"

" نیئں نیئں ، ایسا تھوڑی ہے ۔ ہم سال کے سال بجز عید پر کھاتے

پاس پڑوس والے خرابانی ہوتی تو حصّہ بھجواتے کی نیئں ۔ ؟"

اچانک انھوں نے موضوع بدل دیا ۔ پتہ کیوں ان کا دل اس چھوکری کی غریبی کا حال سن کر بے چین ہو گیا تھا ۔ وہ بڑی محبت سے بولے

"ہور پان بنانا آتا کی نیئں ؟"

اُس نے خوشی خوشی جواب دیا ۔" ہَو، پان بنانا تو بہوت اچھے سے آتا ۔ میری امی پان کھاتی ہے ۔؟ وہ کام میں رہتی تو میرے کو اچ بولتی ۔" بھولی، ذرا پان تو بناکے دے دے ایک ۔" کبھی کبھی تو میں خود بھی کھا لیوں تو امی بہوت ڈانٹتی ۔ پن آج تو میرے کو امی خود کھلائے کوئی ۔ یہ دیکھئے ۔"

اور اس نے اپنے سرخ انگارے جیسے ہونٹ نواب صاحب کو گھوم کر دکھائے تو وہ خود بھی انگاروں کی طرح دہک اٹھے ۔

ایک ذور دار پان ۔" انھوں نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں سمجھایا ۔

شراب کباب ۔ پھر مرغن کھانوں ، تر تراتے میٹھوں سے نپٹ کر وہ سیدھے اسی کمرے میں چلے آئے تھے ، جہاں روز ان کی سیج پر ایک نئی اور کوری جامدانی کی طرح سل سل کرتی لڑکی موجود ہوتی ۔

میٹھے میں شکر زیادہ تھی ۔ حلق تک چلا آ رہا تھا ۔ ایسے میں پان کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی ۔

بھولی نے پان بنا کر دیا تو اپنے ہونٹوں سمیت ان کے قریب چلی آئی تھی ۔ وہ تپ رہے تھے ۔

" انگلیوں میں پکڑ کو پاناں تو ماداں بہنا بھی کھلا سکتے ۔" وہ ایک گرم سی ہنسی ہنسے ۔

"یہ ہونٹاں کس کے واسطے ہیں؟ پان تو بنا کو دے دی — اب ہونٹوں میں ہونٹاں بھی دے دے۔

جالی دار کھڑکی کے نیچے اُدھر کھڑی امنی منتظر رہی کہ اب بوسوں کی پٹاپٹ شروع ہوگی، مگر معلوم ہوتا تھا کہ بھولی یا تو کچھ سمجھ نہیں رہی ہے یا شرما رہی ہے — وہ اندر ہی اندر کھول رہی تھی — "اب یہ اِنے چھنال بے دھنول کی شرم لے کو بیٹھ گئی تو بھلا نباب صاب کاٹے کو انعام اکرام دیتے پھریں گے؟ ہور یہ وخت تو پھر بار بار آنے والا نہیں — موتی کی آب ایک بار اُتری سو اُتری وہ تو کھو رانڈ کی خسمت تھی کہ خفل کھُلائی کے واسطے کیٹنوں کی نظر میں وہ بچ گئی نئیں تو ایسے ایسے تو کِتے کِتے چھوکریاں حیدر آباد میں پڑے سڑ رئے ہوئیں گے۔"

امنی نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے آپ میں گم کو سا بیٹی شروع کر دی۔

"آگ لگے چھنال کی شرم کو — پہلے اچ جتا کو اندر بھجائی تھی کہ شرمانا ورمانا مت۔ جو بھی بولے سو کرنا۔ کوئی بھی بات کو نکو ٹکو مت کرنا۔ آخر دس روپے خرچہ کرا سو آدمی کچھ تو منگے گا — اب یہ مونڈی کٹی ......"

مگر خوش بختی کے نقارے کی طرح آخر وہ چوٹ پڑہی گئی۔ بڑھیا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ "مالک تیری دین کے سو طریقے ہیں — شکر ہے۔"

ان ہونٹوں کا سارا رس جیسے ان کے جسم میں پھیل گیا۔ انھوں نے سرشار ہوکر کہا: "اب یہ سوب کپڑے اتار دے۔"

اس نے منہ پھیر کر ایک ایک کر کے سب کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔

اوپر سے جو بھی تھی سو تھی، اندر سے تو سنگ مرمر کا مجسمہ نکل آیا ہو۔ جیسے وہ لمبی لمبی ہانپتی کانپتی سانسیں لے کر بولے "اب ادھر آجا۔"

اس نے مارے شرم کے اپنے کھلے بال دو حصوں میں سامنے کر کے اپنی عریانی ڈھانپنے کی ناکام سی کوشش کی۔

وہ اٹھے، اُسے اپنے قریب کیا۔ خوبصورت نوخیز مرمریں اُبھاروں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر انھیں ایک دوسرے سے قریب کر کے انھوں نے بیچ میں اپنی ناک رکھ دی۔

"ہا!" زور سے سونگھ کر انھوں نے کہا۔ "خدا کی قسم، تو بالکل کوری اور کنواری ہے۔ ہم نوی چھوکری اور نوے کپڑے کی خوشبو سونگھ کر ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ استعمال شدہ ہے کی نوا۔"

اُن کے ہاتھوں کے لمس سے اس کے کنوارے جسم پر چھوٹے چھوٹے روئیں اُبھر آئے — وہ بہر حال ایک سولہ سال کی لڑکی تھی۔ پاکباز سہی، لیکن جب ان حالات سے دوچار ہونا پڑے تو اتنی عقل تو آ ہی جاتی ہے۔ جو یہ سمجھ سکے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ کیونکہ بہر حال اس کی امیّ کو پیشگی دس روپے دے جا چکے تھے اور دنیا میں کوئی کسی کو یوں ہی پیسے نہیں دیا کرتا — ویسے یہ اس کا بے پناہ حسن اور خدا کی مہربانی ہی تھی کہ اسے دس روپے دیئے گئے۔ ورنہ "قفل کھلائی" کی رسم کے دو روپے تو بندھے ہوئے تھے۔

نواب صاحب اُسے اس قدر دبوچ کر گہری نیند سو رہے تھے کہ وہ ہل جل بھی نہیں سکتی تھی — اُترتی رات میں اُن کی نیند کچھ ہلکی پڑی تو اسے بھی سکون سے

سانس لینا نصیب ہوا۔ نواب صاحب کے برابر سونا اُسے کچھ عجیب سا لگا۔ چاہا کر اُتر جائے۔ سوچا ناراض ہو جائیں گے۔ اتنے بڑے نواب ہیں۔ کھڑے کھڑے مروا دیا تو۔؟ زندگی تو ہر حال میں پیاری ہوتی ہے۔ غریبی سے ہی سہی زندگی، زندگی ہے۔ وہ پائینتی کی طرف لیٹ گئی، نیند تو کانٹوں پر بھی آجاتی ہے۔ وہ تو پائینتی تھی۔ پائنتی بھی کس کی اور کیسی؟ نواب صمدیار جنگ کی،۔ مخمل کی اور ریشم کی۔ وہ وہیں سو گئی۔

صبح صبح نیند کے زور میں نواب صاحب نے ایسی زور کی لات ماری کہ وہ پٹ سے نیچے جا گری۔ بوکھلا کر دیکھا تو سورج نکل آیا تھا اور وہ بالکل ننگی تھی۔ اس نے لپک کر اپنے کپڑے اُٹھانے چاہے۔ سامنے قد آدم آئینہ تھا۔ خوبصورت اور بے مثال مخملیں جسم پر یہاں وہاں نیل، چٹکیوں کے نشان گردن سے نیچے۔ اور نیچے۔ اور نیچے۔ دانتوں کے نشان جو رات بھر میں کتھئی رنگ اختیار کر چکے تھے۔ جیسے کتّے کچے گوشت کو بھنبھوڑتے ہیں۔

اس نے ڈر ڈر کر، پلٹ پلٹ کر سوئے ہوئے نواب کو دیکھتے ہوئے محرم کرتا، پاجامہ سب چڑھایا۔ دوپٹہ اوڑھا۔ اور ہولے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

دیوار سے لگی بڑھیا اونگھتے چونکی اور اپنی بچی کو پہچان کر لپکی ہوئی آئی۔

"کچھ انعام ملا کی نئیں، بھولی۔ کیوں کی سبھی لوگاں بولتے کی نواب صاحب بہوت بھی بہوت غریب پرور ہیں۔؟"

دوپٹے کے کونے میں بندھے ہوئے، رات نواب صاحب کے دئے ہوئے پانچ روپے کھن کھنا رہے تھے۔ اس نے کونا ماں کی طرف بڑھادیا اور زخمی آواز میں بولی" ہو امنی نباب صاحب بہوت دل والے ہیں۔ بہوت رحم والے ہیں۔"

صبح کو ناشتے میں شامی کباب اور سارے لوازم دیکھ کر اچانک نواب صاحب کو رات والی لڑکی یاد آگئی۔ انھوں نے اپنے معتمد خاص کو بلایا اور ذرا فکرمند لہجے میں پوچھا۔" رات کو جو چھوکری محل کو آئی تھی وہ کاں رہتی۔؟"

معتمد خاص ہڑبڑا گیا۔ نواب صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک بار جو بھی چیز استعمال کرلیں۔ چاہے وہ لڑکی ہو یا جوتی، کپڑا ہو یا موتی، دوبارہ ہرگز استعمال نہیں کرتے ــــ تو پھر آج یہ گزری ہوئی رات کے سائے کے پیچھے لپکنا کیسا؟ ذرا رکتے ڈرتے اس نے جواب دیا" جی حضور ــــ وہ چار مینار سے کچھ آگے کوٹلہ عالی جاہ ہے نا، اسی کے قریب اس کا گھر ہوتا۔"

گوشت کے پکوان اور شامی کباب ان کے حلق میں اٹک رہے تھے۔ انھوں نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اٹھتے ہوئے بولے۔" ڈرائیور سے بولو کی گاڑی نکالو ذرا۔" اور سیدھے زنان خانے کی طرف لپکے۔

بی اماں چاندی کی پلنگڑی پر چاندی کا پاندان کھولے اپنی رعیت میں گھری بیٹھی تھیں۔ سرکار کو آتا دیکھا تو ساری رعیت چھٹ گئی ــــ نواب جاکر ماں کے گلے کا ہار ہوگئے۔ بی اما بڑی حیران کہ بے بات آج یہ پیار کیوں پھٹا پڑ رہا ہے۔ الگ ہوکر دعائیں دیتے ہوئے بولیں۔

" خدا خیر کرو آج یہ ہاتھاں میرے گلے کا ہار کائے کو ہوگئیں؟"

" اماں جانی انھوں نے ہنس کر کہا" ہم ایک لڑکی پسند کرلئے۔ آپ کی

اجازت ہو تو شادی بھی ہو جائے۔

بی اماں کو اوبدا کر غصہ آگیا۔" میاں بن ناحق کو میراجی نکو جلاؤ۔ ابّا بول بول کے یہ عمر کر لئے۔ چالیس سے اوپر ہی ہوئیں گے تمہیں۔ تمہارے عمراں والے تو ناتی نواسوں والے بن بن کو گئے اور تم بس سہرے کو جلا لیتے ہی بیٹھے۔"

بی امّاں مذاق ہی سمجھ رہی تھیں۔

" نہیں اماں جانی، ہم سچ بول رہے ہیں۔ آپ خود دیکھیں گے تو پتہ چلیں گا کتنی اچھی لڑکی ہے۔ بس یہ ہے کہ ذرا کم پڑھی لکھی ہے۔ ہور ذرا غریب گھر کی ہے"

بی اماں کے چہرے پر ذرا سے یقین کی پرچھائیں اُبھری، دل کی خوشی کو، چہرے پر آنے سے روک نہ سکیں مسکرا کر کہنے لگیں " لگے میاں ہنا، کون سے بہو کو نوکریاں کرانا ہے کی اس کو بہوت تعلیم ہونا۔ خط لکھی پڑھی سو بس ہے ہور غریبی کی بات تو یہ ہے میاں کہ ہم کو اللہ اتّا دیا۔ سو اب بیٹی والوں کی غریبی کا کیا غم؟ اِتّا ہے کہ بس عزّت دار لوگاں ہو نا۔"

عزّت! نواب صاحب کو یہ کچھتاوے کے ساتھ گزری ہوئی رات کا خیال آیا۔ وہ کلی جو اُن کے اپنے ہاتھوں پھول بنی تھی: کیا اس کی پاکیزگی اُس کا بھولپن کسی اور ثبوت کا محتاج تھا۔؟ وہ ذرا غم ناک سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے " اماں جانی وہ لوگاں تو اتنے عزّت والے اور اتنے پاکیزہ اور بھولے ہیں ——— کہ فرشتے بھی اُن کے دامن پہ نماز پڑھنے میں اپنی بڑائی سمجھتا

" تو پھر میں شادی کے تیاریاں شروع کر دا دیوں۔؟ بی اماں خوشی کو دباتے ہوئے بولیں۔

جی ہو ۔" اُٹھتے اُٹھتے انہوں نے سعادت مندی سے کہا ۔۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگے۔" دس روپے پیشگی اور پانچ روپے بخشش کے ۔۔ اُن پندرہ روپوں کا کفارہ بس اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مہر پندرہ لاکھ بندھوالیں ۔

موٹر میں بیٹھنے سے پہلے انھیں کچھ خیال آیا تو وہ پھر اُلٹے پاؤں بی اماں کے پاس آئے۔

" ایک بات سنئے اماں جانی ۔۔ شادی بھر جتنے بھی پکوان پکیں گے ، سب گوشت کے ہوں گے ۔

بی اماں نے ان کے چہرے کو ذرا حیرت سے دیکھا اور کہا " ائی میاں ، تم گوشت کے اتنے بھی شوقین کب سے ہو گئے ۔ ؟"

وہ منہ سے کچھ نہ بولے ۔ مگر ایک میٹھی سی مسکراہٹ نے ان کے پورے چہرے کو چاند کی طرح روشن کر دیا ۔

اللہ کے نام پہ

گوری پاشا نے مریم کو دودھ جیسا سفید لباس پہنا کر عطریات اور خوشبوؤں میں ڈبو دیا۔ اُبٹن اور چیکہ مل مل کر نہلانے سے آگے ہی اس کا رنگ سونے کی طرح دمک اُٹھا تھا۔ پیٹھ پر سنہرا آبشار اُمڈا پڑ رہا تھا۔ سبز آنکھوں میں سرمے کی باریک سی لکھاوٹ نے الٹا ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا سبز ریشمی چوڑیاں گوری پان کلائیوں میں کبھی جا رہی تھیں۔ رہی سہی کسر سانچے سفید موتیوں کے زیور نے پوری کر دی، کمرہ عود، لوبان اور کچے اگر کی فرزانوں کو دیوانوں میں بدل دینے والی خوشبو سے سلگ اٹھا تھا۔ سمندر جھاگوں کی سی سفید چادر پر قبلہ رو بٹھا کر گوری پاشا نے مریم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اور لرزتی کانپتی آواز میں آسمان کی طرف دیکھ کر بولیں۔

" میرے اللہ تیرے نام پہ آج اس کنواری کو سدا کنواری کا روپ دے کر چھوڑ رہی ہوں۔ مالک! میرے اس تحفہ چڑھاوے

کو قبول فرما اور میرے حسن بانو کے سہرے کے پھولاں کھلا دے ۔ اس کو زندگی نصیب کرے ۔"

مارے رقت کے ان کی آواز نے دم توڑ دیا ۔ پاس کھڑی شمشاد بوا کی حالت تو اور غیر تھی ۔ انھوں نے کھڑے کھڑے دوپٹے کا میلا بوسیدہ آنچل منہ میں دبا لیا مگر پھر بھی سسکی نکل ہی گئی ۔

گوری پاشا اپنی رقت بھول کر جل کر مڑیں اور تڑاخ سے بولیں

"ائی اب تجے کائے کو بول لے رئیں ۔ کھن کھن تمارے ہاتھاں کو پانچ سو روپے گن کو نہیں رکھ دی کیا میں ؟"

ماںتا کی ماری شمشاد بوا منہ سے کچھ نہ کہہ پائی ۔ کہتی بھی کیا ؟ یہ حقیقت تھی کہ دو دن پہلے ہی گوری پاشا نے ایک نہ دو پورے پانچ سو روپے شمشاد بوا کی جھولی میں گن کر ڈال دئے تھے ۔ میاں دو روپے ماہوار پر ڈیوڑھی کی دربانی کرتے تھے ۔ وہ خود چار روپے مہینے سے ماماگیری کے فرائض انجام دیتی تھیں ۔ خدا کا شکر تھا کہ پیٹ بھر روٹی اور سال میں دو جوڑے جب زکوٰۃ بٹتی تھی مل جاتے تھے ۔ صبر والی بی بی تھیں ۔ اس سے زیادہ کی انھیں حاجت تھی بھی نہیں ۔ بٹیا مریم ابھی آٹھ نو برس کی ہی تھی اس کی فکر بھی کیا تھی ۔ جس طبقے سے شمشاد بوا تعلق رکھتی تھیں وہاں لڑکیوں کی شادی کے لئے نہ کسی جوڑ جماؤ کی ضرورت ہوتی ہے نہ اندیشوں کی ۔ جوانی جب چپکے سے دستک دیتی ہے تو پاس پڑوس میں اچھا لڑکا دیکھ کر دو جوڑے دے کر بیٹی بدا کر دی جاتی ہے ۔ ایک جوڑا لال نکاح کا ایک جوڑا ہرا ۔ دوسرے دن جو تھی کا ، قصہ ختم ۔ اسی لئے مریم کی انھیں

کوئی فکر نہ تھی اور وہ اسے محلے کے مولوی صاحب سے قرآن شریف اور اُردو پڑھنے پابندی سے بھیج رہی تھیں کہ لڑکی اللہ رسول کے نام سے تو واقف ہو جائے ۔ لیکن قسمت ۔ اوندھی قسمت نے کس کا ساتھ دیا ہے؟ میاں دربانی کرتے کرتے ایک دن درد کی شدت سے نڈھال ہو کر ڈیوڑھی کے توی ہیکل دروازے پر گر کر تڑپنے لگے ۔ بڑی دوڑ دوڑ مچی ۔ حکیم صاحب بلوائے گئے ۔ پتہ چلا پیٹ میں جس جگہ شدید درد اُٹھ رہا ہے وہاں بڑی سی رسولی پیدا ہو گئی ہے ۔ علی میاں عمر کے اس دور میں تھے کہ مر بھی جاتے تو کس کا نصیب لے کر جانے والے تھے ؟ مگر جیتے جی کو یوں ہی چھوڑا بھی نہیں جا سکتا ۔ دو روپے مہینے کی آمدنی بھی گئی ۔ دو وقت کا کھانا بھی گیا اور اوپر سے علاج معالجہ الگ ۔ نہ اچھے ہی ہوتے تھے نہ مر ہی چکتے تھے ۔ پھر شمشاد بوا کو آئے دن ان کے درد کے دوروں کی وجہ سے بھاگ بھاگ کر کام کاج چھوڑ چھوڑ کر جو جانا پڑتا تھا اور کام میں ہرج جو ہوتا تھا اس کا پیسہ گوری پاشا الگ کاٹ لیتیں ۔ بڑے نواب صاحب نے کبھی کسی سوالی کو واپس نہیں پھیرا ۔ ہمیشہ ساتھ دستر خوان پر بٹھال کر کھانا کھلاتے اور بات بستر تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ۔ ممکن تھا کہ شمشاد بوا کبھی بڑے نواب صاحب تک اپنا سوال لے کر پہنچ بھی جاتیں لیکن وہ اپنی عزت کو ڈرتی تھیں ۔ چند ٹکے ہی تو سب کچھ نہیں ہوتے ۔ روپیہ تو پٹھان سے بھی تھوڑے بہت سود کے ساتھ مل ہی جاتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ سود بڑھتے بڑھتے اصل سے بھی گزر جائے ۔ اور یوں کہ پھر حریص نگاہیں کچی کلیوں تک پہنچ کرنے کی سوچنے لگیں ۔

پٹھان سے لی ہوئی چھوٹی چھوٹی رقمیں چار سو کی خطیر رقم بن کر ناگ کی طرح دن رات شمشاد بوا کو ڈسا کرتیں ۔ میاں جئے مرے برابر تھے ۔ بس دنیا سے ان کا اتنا ہی ناطہ باقی رہ گیا تھا کہ مدہوشی کے عالم میں بھی منہ کھول دیا کریں ۔ اور کوئی چمچوں سے ان کے منہ میں آن پانی ٹپکا دیا کرے زندگی کا سارا وبال تو شمشاد بوا کو سمیٹنا تھا ۔ ابھی ہفتہ بھر پہلے ہی پٹھان نے کہلوا بھیجا تھا کہ تمہارے ہاں تو ایسی کوئی قیمتی چیز بھی نہیں جس کی قرقی یا نیلامی ہو سکے، لے دے کے ایک چھوکری ہے، تو تم چاہو تو اسے ہمارے نکاح میں دے دو ۔ بڑی ہونے تک ہم کھلا پلا لینگے ۔ بعد میں وداع دے دینا شمشاد بوا کا تو دل ہی دہل گیا ۔

"ایسی ننھی سی، سچ مچ کلی کی سی بچی، نازک چڑیا کا سا تن ۔ اس پٹھان کو لاج نہ آئی ذرا ۔ ان کی راتوں کی نیند اڑ کر رہ گئی ۔

لیکن ابھی دو دن پہلے کی بات تھی مریم مدرسے سے سبق لے کر لوٹی تھی اب وہ اچھی طرح اردو پڑھ لکھ لیتی تھی ۔ نماز بھی پوری یاد ہو چکی تھی اور نو سال کی ننھی سی عمر میں قرآن شریف کے کئی دور بھی ہو چکے تھے وہ ابھی اپنی ماں کو اول کلمہ طیب سنا ہی رہی تھی کہ خلافِ معمول گوری پاشا صحن میں آنکلیں اور بڑی محبت سے بولیں ۔" ایو تیرا خران شریف بھی ہو گیا، نماز و ماز سب یاد کر لی، پھر ابھی تک کا اوّل کلمہ اچ پڑھتی رہتی ؟ "

مریم کچھ شرما کر بولی ! نہیئں پاشا، مولوی صاحب بولتے نماز اور خران شریف کا ایسا ہے کہ روز کا روز آموختہ کرتے رہے تو یاد رہتا نہیئں تو انسان

بھول جاتا۔ اسی واسطے میں روز ای کو پڑھ کو سنا تیوں۔"

"اچھا اچھا" کہہ کر گوری پاشا ذرا ہنسیں اور کہنے لگیں "اس گے مریم ذرا چوک کے حلوائی کنے سے سیر بھر جلیبی تو لے کو آجا۔ تیرا ختم قرآن شریف ختم ہوا پر میں کچھ بھی نہیں کری۔"

مریم کچھ شرمائی مگر انھوں نے پیسے اس کے ہاتھوں میں تھما ہی دیئے شمشاد بوا اس بلا وجہ کی مہربانی سے بری طرح خائف ہوئی جا رہی تھیں کیونکہ وہ اپنی ساری زندگی اسی ڈیوڑھی میں گذار چکی تھیں اور خوب جانتی تھیں کہ جہاں گڑھا ہو پانی وہیں ٹھیرتا ہے، گوری پاشا کی محبت مطلب سے خالی نہیں ہو سکتی۔

جیسے ہی مریم ٹلی گوری پاشا شمشاد بوا کے پاس کھسک آئیں اور گڑگڑاتے ہوئے لہجے میں بولیں۔" شمشاد تو اس گھر کا نمک کھائی دی ہے۔ میں کبھی کچھ مانگی تو انکار تو نئیں کریں گی تو ؟"

شمشاد بوا گھبرا کر بولیں ! پاشا میرے پاس ہیچ کیا بول کے ؟ پر آپ جو مانگو حاضر کر دوں گی ..."

گوری پاشا رونے پر آگئیں ! تیرے کو معلوم نا شمشاد میری حسن بانو پورے ستا دیس سال کی ہو گئی۔ کاں کاں منتاں مراداں نئیں مانی، کیا کیا توڑ جوڑ نئیں کری۔ پچاس ہزار کی جائیداد جہیز کے نام پو لکھ کے چھوڑیوں۔ سر دنگر والی نوی ڈیوڑھی جہیز میں ڈال کو رکھی یوں سکتے"، زیوراں، بھاری بھاری کپڑے لتے سب کچھ کر کو بیٹھ گئی۔ مگر اللہ صورت دیا سوالیسی کا کوئی آج تک ایک بار دیکھ کو جا کو پلٹا اچ نئیں۔ اب میرے کو پیر و مرشد مشورہ

دیئیں کی تے اللہ کے نام پہ ایک کنواری لڑکی عمر بھر کے واسطے چھوڑ دیو۔ عمر بھر اس کی شادی ہونا نہ اُسے کسی مرد کا منہ دیکھنا۔ ایسی منت کرے تو جلدی سے بیٹی کو بر مل جاتا۔ اب میں اپنا دامن تیرے سامنے پسار تی ہوں تیری چھوکری اللہ رسول سے واقف، نماز، روزہ اس کو آتا، انے ایک کمرے میں پڑی رہے گی اور تمام زندگی خدا کی عبادت کریں گی۔" پھر وہ ذرا رک کر بولیں: "میں تیرے کو پورے پانچ سو روپے دیوں گی۔ ایسا مت سوچ کہ تیری بیٹی کو لے لیوں گی۔ پھر اللہ کے نام پوجیا ایسی ننگی بھو کی نذر تھوڑی چڑھادوں گی، موتی مونگا، کپڑا لتا بھاری سے بھاری پہنا کو چھوڑ دوں گی،۔"

شمشاد بوا کا سر گھوم رہا تھا۔ ایسی عجیب وغریب مانگ! یہ حقیقت تھی کہ انکار فضول تھا۔ وہ انکار کرتیں تو آج کھڑے کھڑے نوکری سے نکلوا دی جاتیں پھر بیمار میاں اور جوانی سے قریب آتی ہوئی لڑکی کو لے کر کہاں جاتیں۔ ؟ اور پھر جو پٹھان دانت نکالے بیٹھا ہوا تھا۔ گھبرا کر انھوں نے ایک دم حامی بھر دی۔

"مگر دیکھو شمشاد بوا مریم کو عمر بھر کنواری رکھنا پڑیں گا۔ کتا بھی اچھا پیام آؤ تمہاری نیت نئیں بدلنا پھر۔"

شمشاد بوا کو ذرا ہنسی بھی آئی، ہم جیسوں کی بیٹیوں کو کدھر کے اچھے پیام آنے کو پڑے؟ انھوں نے رضامندی میں منڈیا ہلادی اور اسی دم گوری پاشا نے پانچ سو روپے گن دیے۔ دل رکھنے کو بولیں "تو دل چھوٹا نکو کرو، ویسے تو گھاٹے میں نئیں رہیں گی۔ ذرا مریم پو اللہ کی نظر

ہونے دے ۔ اتے لوگاں نیاز نذر لے سے کو آئیں گے کی تیرا گھر سونے چاندی سے بھر جائیں گا ۔ صغیرہ بیگم نے اپنی بیٹی کے واسطے جو کنیز اللہ کے نام پلو چھوڑے تھے تیرے کو معلوم ہوئیں گا مجذوب ہوگئی تھی، بے ہوشی میں سچی سچی باتاں بولتی تھی تو کیسے اس کے سامنے لوگاں نذر لے لے کو آتے تھے ۔"
شمشاد بوا سُن بیٹھی رہیں ۔

مگر اب ان سے آنسو روکے نہ رک رہے تھے ۔ کون ماں ایسی ہوگی جو نہ چاہے گی کہ اس کی اولاد کا گھر بسے، سکھ چین سے خوشی ہنسی وہ اپنی سسرال سدھارے ۔ مرد کے ساتھ زندگی گزارے اور بال بچوں میں مگن رہے؟ یہاں تو پانچ سو میں ساری زندگی ہی تلپٹ ہوگئی ۔ مریم کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی ۔۔ گوری پاشاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے محبت سے سمجھایا ! " دیکھ مریم تو زیادہ اس کمرے سے باہر نکو آیا جایا کر ۔۔ تو اب بی بی بن گئی تیرے کو خود اپنی عزت کا خیال ہونا ۔ چپ ادھر ادھر بھاگنا کھیلنا نہیں، بس نماز قرآن پڑھ لیتے بیٹھے رہنا ۔"

مریم نے، جس کے کھانے کھیلنے، بھاگنے دوڑنے کے بھر پور تھے بے حد بے بس اور مظلوم نگاہوں سے گوری پاشا کو دیکھا اور سہم کر سر جھکا لیا

عمر عزیز کے ۲۷ سال پورے کر لینے کے بعد اب حسن بانو میں لڑکی پن کی کوئی ادا باقی نہ رہ گئی تھی ۔ گوری پاشا واقعی گوری تھیں ۔ ماں باپ نے غلط نام نہیں رکھا تھا ۔ مگر گوری پاشا نے جنے کیا سوچ کر بٹیا کا نام حسن بانو رکھ دیا تھا ۔ نام کی اچھی خاصی تہمت تھیں بیچاری ۔۔ پھر کھانے پینے

کی ریل پیل، نہ ماں باپ کی ڈانٹ ڈپٹ، نہ پڑھنے لکھنے کی پابندی۔ گوشت کو جدھر جدھر راستہ ملا بڑھتا چلا گیا۔ بیٹھتیں تھیں تو لگتا تھا گوشت کا ایک چھوٹا سا پہاڑ بیٹھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں ماں باپ کا کیا کرایا، اچھا ہو یا بُرا ـــــ اولاد کے آگے آتا ہے۔ یہ اللہ ہی کو معلوم کہ گوری پاشا اور بڑے نواب نے کیا کیا تھا۔ مگر اللہ کے عتاب میں آئی تو حسن بانو ہی ــ ہزاروں رُپے پیسے کا لالچ بھی کسی کو پرچا نہ سکا۔ کتنے ہی دیکھنے والے آتے ــ آکے پھر جو جاتے تو صورت ہی نہ بتلاتے۔ ماں نے کیا کیا جتن نہ کر ڈالے۔ سہاگ کا جوڑا ان کے جسم تک کبھی نہ پہنچ پایا۔ مشاطہ سے ایک بار تو یہ تک گپ چپ ہو گئی کہ پھلے سے ایک بار کسی اور لڑکی کو بتا دیں گے، ہاں تو ہو جائیے ــ عین وقت پر ڈولی میں حسن بانو کو سوار کرا دیں گے۔ مگر کسی پیٹ پھولی کی وجہ سے یہ پھکل بھی کھل گئی ــ اب آخری حربہ گوری پاشا نے استعمال کر ڈالا ــ اس سے پہلے ان کے اپنے خاندان میں اللہ کے نام پہ تین کنواری لڑکیاں چھوڑی گئی تھیں اور اللہ کی شان مری ماری معمر لڑکیاں بھی دلہنیں بن بن کر سسرالوں سدھار گئیں، تو حسن بانو کے لئے دی گئی نذر اللہ کیسے نہ قبول کرتا۔؟ ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ حیدرآباد ہی کا ایک پیام آگیا ــ گوری پاشا کی جوانی ہی جیسے لوٹ آئی۔ بارہ برس کی چھوکری کی طرح یہاں وہاں اچھلتی پھر رہی تھیں ــ مریم کو ایک اور نیا جوڑا سلوا کر پہنا دیا۔ منہ چوم چوم کر اسے جتایا ــ" دیکھ بی بی دل لگا کو عبادت کیا کر ــ" اور اس کی ماں سے الگ بتایا ــ دیکھ شمشاد حسن بانو کی شادی ہونے کے بعد بھی اسے اللہ کی باندی بنا کو رکھنا ـــــ نئیں تو میری بیٹی کو بُرے دن دیکھنا پڑیں گے۔

پہلے لڑکے کی ماں بہن نے آکر لڑکی دیکھی ۔ حالانکہ پسند نہیں کی ۔ مگر پھر بھی واپس نہ گئیں بلکہ خط لکھ کر اپنے رشتے داروں سے بھی رائے پوچھوالی ۔ جتنے دنوں میں خطوط کے جواب آئیں آئیں بیٹھی مرغن کھانے کھا کھا کر موٹی ہوتی رہیں ۔ پھر ایک دن شکرم منگا کر واپس چلی گئیں ۔ ہاں کہا، نہ ناں

گوری پاشا کا سارا عتاب مریم پر نکلا " تو دل لگا کو عبادت نہیں کرتی جبھی تو لوگاں آکو پلٹ گئیں ۔ یاد رکھ جو گھر سے باہر نکلی ۔ "

پہرا اور کڑا کر دیا گیا ۔

کتنے ہی مہینے یوں نکل گئے اور مریم جوانی کی منزلیں سر کرتی گئی ۔

ایک دن سخت گرمی سے بوکھلا کر مریم صحن میں نکل آئی ۔ شام ہو رہی تھی ۔ نہا کر اس نے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے ۔ موتیئے کا ایک گجرا کلائی پر لپیٹ لیا تھا ۔ ایک دم صحن میں گوری پاشا نکل آئیں اور اسے دیکھتے ہی سن رہ گئیں ۔ جوانی کیسی پھٹی پڑ رہی تھی ! جو جوڑا انھوں نے پچھلے دنوں اسے سلوا کر پہنایا تھا ۔ جگہ جگہ سے بکس گیا تھا ۔ اللہ کی باندی کو گھنوں پاتوں سے کیا کام تھا ؟ گھنوں سے سونے اس کے ہاتھ پاؤں کیسے لس لس کر رہے تھے جسم میں گلابیاں بھر گئی تھیں ۔ ننداسی آنکھوں سے نہا کر اٹھنے کی وجہ سے سرمہ دھل گیا تھا ۔ ایسی کوری صراحی کی طرح گردن اٹھا کر انھیں دیکھا کہ وہ لرز گئیں ۔ آج صبح ہی سمشاد بوا نے ڈرتے ڈرتے ان سے بتایا تھا کہ پرسوں گرمی کے مارے مریم صحن میں نکل آئی تھی ۔ ان کے کسی رشتے دار کے بھتیجے نے اسے دیکھ لیا اور حالات سے بے خبر پیام ٹھونک دیا ۔ تب سے گوری پاشا ڈری سہمی تھیں کہ کہیں مریم کے کانوں تک نہ پہنچ جائے کہ کوئی اس کا

خرید ا رکھی ہے ! آئینہ تو اس کے کمرے میں تھا ہی نہیں ، پانی بھی اسے کٹورے میں نہ پینے دیتیں کہ اس میں عکس دیکھ کر آگاہ نہ ہو جائے کہ کیسا نرگسی حسن پایا ہے!
کم و بیش اور دو سال گزر جانے کے معنی تھے کہ پینتیس سال پورے ہونے میں حسن بانو کو صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے اور مطلب یہ کہ ان ہی دو نوں نے مریم کو قیامت بنا دیا ہے ۔ اور اب تک اللہ نے نذر نہیں قبول کی ۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مریم دل لگا کر عبادت نہیں کرتی ۔

لیکن گوری پاشا کا خدشہ بے بنیاد تھا ۔ اس لئے کہ مریم کی توجہ کا مرکز واقعی صرف خدا ہی تھا اور اس کا ثبوت یوں ملا کہ اس واقعے کے بعد پھر سے اچانک علی گڑھ سے ایک دھڑ دھڑاتا ہوا پیام ایسا آگیا کہ خود نوشہ میاں بھی ماں بہن کے ساتھ چلے آئے ۔

ہوا یہ کہ نواب صاحب کے جان پہچان والوں میں سے کسی کا علی گڑھ جانا ہوا ۔ وہاں حسن بانو کا ذکر نکل آیا کہ بے حساب پیسہ ہے اور لڑکی ۔۔ بس یہ کہ انسان کا بچہ ہے ، کیا مضائقہ ہے اگر دیکھ ہی لیا جائے ۔ حسن نہ سہی دولت ہی بے حساب سہی ۔ گوری پاشا نے مہمانوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا ایسی خاطر تواضع کی کہ عربوں کو مات دیدی ۔ روز دعوتیں روز دعوتیں ۔۔ پھر اسی پر بس نہیں ، مہمان کو یہاں گھمانا ، وہاں گھمانا ، وہاں پھرانا ۔ ایک دن چودہویں کا چاند آسمان پر کھلا ہوا تھا ۔ گوری پاشا نے اپنے مہمانوں کو خوش کرنے کے لئے گنڈی پیٹھ کا پروگرام بنایا ۔ بڑے نواب صاحب کی فورڈ میں سب لد کر روانہ ہو گئے ، سوائے ایک ظفر میاں کے ، ان کا جی ٹھیک نہیں تھا ۔ ویسے بھی وہ ذرا تنہائی پسند تھے ۔

رات بھیگ چکی تھی۔ مارے اکتاہٹ کے وہ صحن میں نکل آئے، امی جان اور باجی کی منطق ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ انھیں ایم لے، کا امتحان دینا تھا اور وہ ان کو یہاں گھسیٹ لائی تھیں پھر یہ کہ چار چھ دن ہو چکے تھے، قاعدے کے مطابق امی جان نے لڑکی بھی دیکھ ہی لی تھی۔ پھر پیام دیکر بست نسبت کر دیتیں۔ پتہ نہیں کیا سوچ بچار رہے؟ کدھر پھنس گیا میں بھی۔ مجھے بھی لڑکی کی ایک جھلک کسی بہانے دکھا دیں گی۔ تو وہ بھی نہ ہوا۔ بر دکھوا تو خیر ہو گیا اور میں انھیں پسند آ بھی گیا۔۔ وہ خود ہی ہنس پڑے۔۔ یہ بر دکھوا بھی عجیب چیز ہے۔ اور اگر میں انھیں پسند نہ آیا تو۔۔؟ انھوں نے صحن میں پڑا ہوا ایک چھوٹا سا کنکرا اٹھا کر یوں ہی ہوا میں اچھال دیا

صحن میں مہندی کی اوٹ میں مریم نے جاءنماز بچھا کر ابھی بھی نماز سے فراغت حاصل کی تھی۔ گرمیوں کی السائی ہوئی رات تھی وہ کمرے کی گرمی سے گھبرا کر اکثر موتیا اور مہندی کی باڑھ کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتی تھی۔ دعاؤں کے لئے اس نے اللہ کے حضور ہاتھوں کا پیالہ سا بنا رکھا تھا کہ پٹ سے وہ کنکرا اس کے ہاتھوں میں آگیا اس نے آگے کو سر جھکا کر دیکھا کہ کنکر کیسے آیا؟۔ اسی دم ظفر میاں کی نظر بھی ادھر ہی اٹھ گئی۔ مریم نے بڑی حیرت سے انھیں دیکھا۔ کتنے سال تک ہو گئے تھے اس نے کسی مرد کی صورت نہ دیکھی تھی۔ اور اب دیکھی تو ظفر میاں کی، سانولا، سلونا مردانہ وجاہت سے بھرپور چہرہ ہلکی ہلکی مونچھیں، سادہ قمیص پاجامہ، اونچا قد، وہ شاید بستر سے اٹھ کر چلے آئے تھے کہ بال بے ترتیبی سے ماتھے تک اتر آئے تھے۔ علی گڑھ کے پہلے، بڑھے، پڑھے لکھے، ظفر میاں ایسی موم کی ناک تو تھے نہیں کہ

حسین چہرے کو دیکھتے اور یوں ہی چپ رہ جاتے، آگے بڑھے اور مسرور ہو کر بولے "آپ اتنی حسین ہیں کہ اصلی نہیں نقلی لگتی ہیں۔ تو پھر امی اور باجی نے دیر کیوں لگائی ہے؟ کیا میں یا دنیا کا کوئی مرد آپ کو ناپسند کر سکتا ہے؟ بلکہ نعوذباللہ آپ کو سجدہ بھی کر سکتا ہے۔"

مریم اب بھرپور جوان تھی، سولہ سال کی عمر میں اس نے وہ رنگ روپ نکالا تھا کہ جو دیکھے بہہ جائے۔ نہ محنت نہ مشقت آرام کی کھانے اور روزانہ کی صفائی اور غسل نے اس جوانی کو بھرپور راستہ دیا کہ بڑھتی چلی آ، اور جب جوانی جوانی کو دیکھتی ہے تو بغیر سمجھائے سب کچھ سمجھ جاتی ہے۔ مریم اب بچی نہ تھی اور یہ بھی سمجھتی تھی کہ اسے راہبہ کا درجہ کس نے۔ اور کن حالات نے دیا ہے۔ وہ ذرا رکتے، جھجکتے بولی، !"آپ غلط نہ سمجھو، میں وہ نہیں جو آپ سمجھ لے رہیں — میں اللہ کے نام پر چھوڑی ہوئی کنیز ہوں، میں مریم ہوں اس ڈیوڑھی کی ماما کی لڑکی۔"

ظفر میاں حیدرآباد کی اس خبیث رسم سے واقفیت رکھتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ حالات کی ماری روحیں ہر کڑا ستم کس طرح اٹھانے پر مجبور ہیں۔ وہ بڑے دکھ سے بولے: "مطلب یہ ہے کہ آپ پر خوشیوں کے سارے دروازے بند ہیں؟"

مریم نے سر جھکا دیا

وہ پھر بولے: "اور آپ نے کبھی اس ظلم کے خلاف کوئی آواز بھی نہیں اٹھائی؟"

مریم نے آنکھیں اٹھا کر انھیں دیکھا۔ وہ سبز آنکھیں جو کاجل سرمے سے

بے نیاز تھیں۔ پھر بھی تلوار تھیں۔

مریم انھیں بس دیکھتی رہی۔ کیا یہ آپ کے نام کی سزا ملی ہے کہ عمر بھر کنوار پن کا دکھ بھوگتی رہیں۔ ؟"

مریم کچھ بھی نہ بولی۔

" آپ کتنے سالوں سے اس عبادت گاہ میں بند ہیں جس کی قید اور زنجیریں آپ کے حسن، جوانی اور الھڑپن کے گرد حصار نہیں باندھ سکیں۔ ؟"

مریم نے ایک لمبی سانس لے کر اپنی خوبصورت کافوری انگلیاں اٹھا دیں

سات سال! میرے خدا، ظفر میاں نے سر تھام لیا" اتنے سارے سالوں میں کبھی آپ نے چاند دیکھا" مریم نے انکار میں سر ہلایا

"کبھی آپ نے پھول دیکھے ؟ کبھی آپ نے برسات کی پہلی بوچھار دیکھی جو پیاسی سے پیاسی دھرتی کو بھی سیراب کر دیتی ہے۔ ؟ کبھی ان آوارہ بادلوں کی آنکھ مچولی دیکھی جو دل میں سوئی ہوئی امنگوں کو جگاتے ہیں۔ ؟ جاڑوں کی گرم صبحیں، گرمیوں کی خنک شامیں۔ برسات کی کپکپا دینے والی راتیں یہ سب آپ کے دل پر سے ہو کر گزری ہونگی، لیکن آپ نے کبھی اپنے حق کے لئے کوشش کی۔ ؟"

"جی ؟ مریم نے بڑے اچنبھے اور بھول پن سے پوچھا۔" میں کیا کوشش کرتی ؟ میں نمازیں پڑھ پڑھ کو دعائیں مانگتی تھی کہ اللہ چھوٹی پاشا کے سہرے کے پھولاں کھلا دے۔

ظفر میاں اچانک آگے بڑھے۔ " اور کبھی یہ سوچا کہ دوسروں کے پھول کھلاتے کھلاتے تمہارے اپنے چہرے کا یہ پھول ایک دن اپنی

تازگی کھو بیٹھے گا۔" اور انھوں نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں مریم کا پاکیزہ چہرہ تھام لیا۔

مریم سر سے پاؤں تک لرز کر پیچھے ہٹ گئی۔ خدا کے واسطے آپ میرے کو نکو چھوڑ۔۔۔ خدا ناراض ہو جائیں گا۔ آپ کو نئیں معلوم۔۔۔"

ظفر میاں تیز لہجے میں بولے۔ "کس خدا نے تمہیں یہ سزا دی ہے؟ اس ڈیوڑھی کے خداؤں نے! اور پرماتما نے آج تک کسی کو ایسی بھیانک سزا نہیں دی۔ جانتی ہو مریم۔ مرد عورت ایک دوسرے کے لئے ہی بنائے گئے ہیں اور خدا نے یہ جوڑے بنائے ہیں۔ خدا جوڑے ملاتا ہے توڑتا نہیں تم۔۔۔ تم شائد میرے لئے ہی تھیں۔"

مریم نے گھبرا کر انھیں دیکھا "آپ کو نئیں معلوم پاشا۔۔۔"

"مجھے سب معلوم ہے مریم۔۔ میں سب جانتا ہوں اس چند دنوں کے مختصر قیام میں، میں اتنا کچھ جان گیا ہوں کہ شائد تم اتنے سارے سالوں کی زندگی میں نہیں جان سکی ہوگی۔ شمشاد بوا کو جانتی ہو انھوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بھی کہ امی جان اور باجی ہیص بیص میں ہیں۔ بے انداز دولت نے ان کی آنکھیں چکا چوند کر دی ہیں۔ اور یہ طے نہیں کر پا رہے ہیں کہ مجھ سے بڑی، جو شکل صورت میں بھی اچھی نہیں ایک لڑکی کے عوض یہ سودا قبول لینا دانش مندی ہوگی یا بے وقوفی۔" وہ رک کر ہنسے، اور شمشاد بوا نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ تم ان کی اکلوتی لڑکی ہو۔ مریم نے گھبرا کر سر اوپر اٹھایا۔

"اور یہ بھی کہ اس وقت تم ان ہی کے کہنے پر ادھر مہندی کی اوٹ میں عبادت کر رہی تھیں اور یہ کہ اگر آج رات میں تمہیں یہاں سے لیکر چلا

جاؤں تو وہ باقی زندگی بڑے سکون کے ساتھ گذار سکیں گے۔"

مریم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"میں تو ویسے بھی یہاں سے جانے ہی والا تھا لیکن شاید خدا نے لکھ دیا تھا کہ میں تنہا نہ جاؤں۔" وہ مریم کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش میں اس کے قریب سرک آئے۔" مریم آج تک اس ڈیوڑھی کی ان مہیب اور ہولناک دیواروں نے تمہارا صبر لوٹا ہے، تمہیں منہ چڑھاتی آئی ہیں۔ آج حوصلہ کر کے تم یہ بلندیاں سر کر لو۔"

"مگر... م... م... میں نے پاشا کا نمک..."

نمک اور شکر کو مارو گولی، کوئی کسی کا دیا نہیں کھاتا۔ سب خدا کا دیا کھاتے ہیں۔ تمہاری جہالت نے تمہیں اس قید میں ڈال رکھا ہے تم میرے ساتھ علی گڑھ چلو۔ پہلے ہم شادی کریں گے۔ پھر میں تمہیں پڑھاؤں گا ہاں؟ انھوں نے بڑے پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانکا، وہ آنکھیں وہ کنواری اور معصوم آنکھیں۔ وہ پاکیزہ آنکھیں جو آج تک کسی مرد کی طرف نہیں اٹھی تھیں۔

"اور ہمارے گئے پیچھے لوگاں جو باتاں بنائیں گے؟" اس نے بےحد ڈر کر پوچھا۔

ظفر میاں ہنس دیئے "باتیں بنانے والے کب باتیں نہیں بناتے جان!"

سرخ سرخ بجری ان دونوں کے پیروں تلے بجنے لگی۔ اس کا گلابی گلابی نرم گرم ہاتھ تھامے وہ بڑھتے ہی گئے۔

جھوٹن

"حرام زادے، پاداں دبا رہا کی مذاق کر رہا رے؟" بڑے سرکار نے زور سے لات ماری اور کلوا ایک لڑھکنی کھا دُور جا گرا۔

"ہاتھاں کا دم کانے سے چلا گیا؟ حرام خوروں کو کِتا بھی کھلا دیو پلا دو خون میں جو مستی ہور کام چوری کی عادت ہے سو ہے! اُٹھ ذرا زور دے کو دبا۔"

کلوا اپنی مٹھی بھر ہڈیوں کو سمیٹتا، سہلاتا اُٹھا اور پھر بڑے سرکار کے شاندار بستر پہ ڈرتا، سہمتا چڑھ گیا۔ آج اس کے ہاتھ پاؤں واقعی کام نہیں کر رہے تھے۔ اُسے اُن میں دم ہی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ پیٹ میں کچھ ہو تو انسان میں طاقت بھی آئے۔ یہاں تو زندگی کا طور ہی نرالا تھا۔

ڈیوڑھی کام کاج کرنے والوں سے بھری پڑی تھی۔ ایک تو انائیں تھیں جو غریب، مگر شریف گھرانوں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لائی جاتی تھیں، تاکہ نومولود یا شیر خوار بچوں کو دودھ پلائیں۔ اُن کی چاندی ہی چاندی تھی۔ بیگمات

بیبیوں کا سا، بلکہ اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر کھانا ملتا۔ تاکہ نئی نسل اچھی طرح پروان چڑھے اور بچوں کو دودھ کی کمی نہ رہے۔

دوسرے درجے پر مامائیں تھیں جو مطبخ کی کرتا دھرتا تھیں۔ پہلے اُن ہی کے ہاتھوں سے ہو کر کھانا یا اثاث لوگوں تک پہنچتا تھا۔ چکھتے چکھتے ہی اتنا اُڑا جاتیں کہ پیٹ بھر جاتا، اور جو یہ نہ ہوتا تو چُرا چُرا کر پیٹ بھر لیتیں۔

تیسرے نمبر پر اوپر کے کام کاج کی چھوکریاں اور چھوکرے، مالی، تمبولی، چوکی دار اور چاؤش آتے تھے۔ جن کا کھانا ڈیوڑھی سے ہی ملتا تھا۔ انکا کھانا کھٹی دال، چاول، سبزی پر مشتمل ہوتا۔ بڑی سرکار کھانا بٹنے کے وقت خود آ کھڑی ہوتیں ——— وہ اچھے خاصے چمچوں کو جن میں ذرا بھی گہرائی ہوتی ٹھونک پیٹ کر سیدھا کرا لیتی تھیں۔ کیوں کہ ڈونگے اور گہرے چمچوں میں زیادہ سبزی اور دال چلی جاتی ہے، اور خواہ مخواہ اناج کی بربادی ہوتی ہے۔ اب یا تو اُلٹے چمچ سے کھانا پروسا جاتا یا اُن ٹھونکے پیٹے چمچوں سے۔ بہرحال پیٹ تو سب کا پل ہی رہا تھا۔

اب چوتھے نمبر پر ساری مصیبت اُن اوپر کے کام کرنے والے چھوکروں کی تھی جو مردانے میں محض "سوکھے" پر نوکر تھے۔ دو روپے کلدار ان کی تنخواہ ہوتی کھانا اُنہیں اپنے گھر پر جا کر کھانا پڑتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ ڈیوڑھی کے ہنگاموں میں چھٹی مل بھی نہ پاتی اور کام کرتے کرتے اُنہیں ایسی زور کی بھوک لگنے لگتی کہ آنتیں اُلٹ اُلٹ کر منہ کو آنے لگتیں اور گھر جا کر بھی کون سے تر ترا تے، پراٹھے، پلاؤ اور میٹھے ان کے استقبال کو موجود ہوتے۔ وہی کھٹی دال اور موٹا چاول جو اُنہیں شاید صدیوں سے ورثے میں ملا ہوا تھا۔

کلوا اس لحاظ سے بڑا خوش نصیب تھا کہ بڑے سرکار کے منہ چڑھا ہوا تھا ـــــ منہ چڑھا ان معنوں میں کہ اُن کے بستر کا راز دار تھا۔ ایک سے ایک طرح دار چھوکری اس نے لاکر بڑے سرکار کے بستر پر "نون غنّہ" بنا دی تھی ـــــ اور بڑے سرکار کو اس کی اس خوبی کا پتہ بھی نہ چلتا اگر ایک دن وہ اُسے زنان خانے میں جاکر پان لانے کو نہ کہتے۔ اب پاندان پر تو مشتری حکمراں تھی، جسے چاہے دے اور جسے چاہے دھتکار دے۔ اور ایسی حرّافہ کہ کچھ پوچھو نہیں۔ اس لئے کلوا ڈرتے ڈرتے کان کھجا کر بولا: "پاشا، پان لانے کا آپ جمیدکو بولونا۔"

"وہ کائے کو؟" نواب صاحب نے غصے سے کہا: "تیرے ہاتھاں مہندی میں پلٹے کیا؟"

اب کی بار کلوا کان اور سر دونوں کھجا کر بولا۔ "نیئں پاشا ویسی بات نیئں۔ وہ مشتری ہے نا، اُنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " وہ چُپ رہ گیا۔

"کیا کرتی مشتری؟" بڑے سرکار چڑ کر بولے۔

"پاشا" وہ منمنا کر بولا "وہ نمبر ایک کی چھنال ہے۔ اُنے میرا ہاتھ لے کو اپنے سینے پر رکھ لیتی۔" پھر وہ بڑے معصوم لہجے میں شرما کر بولا "ہو پاشا مولبی صاحب بولے کی شریف مرداں بس اپنی بیوی کے سینے کو ہاتھ لگاتا۔ اُنے تو غیر ہوئی نا ـــــ؟"

بڑے سرکار کو اس وقت نہ مولبی صاحب سے غرض تھی نہ اُن کے وعظ سے۔ اُن کے تصوّر میں تو جگمگاتی ہوئی مشتری گھوم رہی تھی جو اتنی بے باک تھی اور کم بخت زنان خانے میں چاکری کر رہی تھی۔

پھر کلدار ایک ــــــ پورا ایک روپیہ، یعنی آدھے مہینے کی تنخواہ پوری کلوا کے ہاتھ میں آگئی ــــــ یعنی تنخواہ کے علاوہ تنخواہ! بدلے میں وہ منتری کو پٹا کر مردانے تک رات کے اندھیرے میں لے آیا اور رات کے اندھیرے میں ہی تو چاند جگمگاتا ہے۔

بس اس کے بعد تو یہ معمول ہو گیا کہ کلوا بڑے سرکار کا مشیرِ خاص بن گیا۔ خانہ باغ سے لیکر، معظم جاہی مارکیٹ سے لے کر، چار مینار کے اطراف سے لے کر، کوٹلہ عالیجاہ سے لے کر، میر عالم کی منڈی سے لے کر، پنجی بیّراق سے لے کر محبوب کی مہندی تک، کوئی جگہ ایسی نہ بچی جہاں کے پھیرے اُس نے نہ مارے ہوں اور بڑے سرکار کی خدمتِ اقدس میں ہر رات ایک نیا چاند طلوع نہ کر دیا ہو۔

وقت اور بیوپار سلیقہ بھی سکھا دیتے ہیں۔ اب وہ محض ایک روپے کے عوض ایک چاند سپلائی نہ کرتا۔ کسی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے تو دو سے لے کر پانچ روپے تک بھی بنا لیتے۔ کبھی دس تک بھی نوبت پہنچی، کبھی کبھار اس سے بھی زیادہ۔ لیکن رہا وہی ڈیوڑھی کا "باہر کا پوتّا"؛ سارا پیسہ وہ اضلاع میں رہنے والے ماں باپ کو بھجوا دیتا، جن کی حقیر سی زمین مستقل قرضوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ کھانا کلوا کا ابھی تک اس کے ذاتی گھر میں ہی ہوتا۔ جہاں اُس کی بیوی کھٹی دال، موٹا چاول پکا کر اُس کا راستہ دیکھتی ہوتی۔ لیکن بڑے سرکار کا مشیرِ خاص بننے کا ایک فائدہ ضرور ہوا تھا۔ آئے دن اُسے رات کے کھانے میں سے بچی ہوئی انواع و اقسام کی نعمتوں سے بھرا طشت یوں ہی مل جاتا۔ بڑے سرکار تھے دل والے۔ شراب، کباب اڑانے کے بعد ویسے بھی انسان

کو کتنی بھوک باقی رہ جاتی ہے ـــــ جنت کی سی نعمتوں سے بھرا طشت خاص الخاص بڑے سرکار کے کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا کیونکہ نشے کے مارے ان کے لئے اپنے آپ چلنا بھی دُدبھر ہو جاتا۔ یوں ہی تھوڑا بہت ٹونگ کر کھلانے والے خادم سے کہتے "طشت واپس نکّو لے جاؤ۔ اپنے کلوا بیٹھا ہے باہر، اس کو دے دیو یہ جھوٹن اس کا اِچ حصّہ ہے۔"

کھلانے والا خادم اس عنایت پر جل بھُن کر خاک ہو جاتا اور اپنے جی کی جلن مٹانے کے لئے باہر بیٹھے ہوئے کلوا سے پکار کر کہتا "یہ لے جھوٹن کھا کو برتن خالی کر کو جلدی سے دے دے میرے کو"۔ وہ جھوٹن پر زیادہ زور دیتا۔ لیکن نعمتوں سے بھرے ہوئے خوان اسی صورت میں کلوا کو ملتے تھے جب بڑے سرکار کہیں مدعو نہ ہوتے، جس دن وہ کہیں دعوت میں تشریف لے جاتے یا جس دن اُن کی طبیعت سست ہوتی اور وہ زنان خانے میں کھلوا دیتے کی آج کھانا نہ بھجوایا جائے تو کلوا کی میّت اُٹھ جاتی۔ دن بھر کا بھوکا، پیاسا، نہ ہاتھوں میں دم، نہ اُنگلیوں میں جان بس یوں ہی ہل ہل کر برائے نام پاؤں دبلتے جاتا، اس طرح کہ بڑے سرکار کے پیروں پر تو کم وزن پڑتا اور کلوا خود اپنے جسم کو زیادہ جھکولے دیتا رہتا اور اسی جھکولے میں غصّے سے بھرے ہوئے سرکار کی ایک آدھ لات ایسی کراری پڑتی کہ کلو مسہری سے دھپ سے نیچے جا پڑتا، دوبارہ اپنے آپ کو سمیٹتا اور پائنتی پر چڑھ جاتا۔

ایسی ہی لات اُس کے آج پڑی تھی، مگر آج جو سرکار نے اُس کے لات ماری تو اس میں پاؤں اچھی طرح نہ دبانے کی سزا کم اور کوئی اچھی سی لڑکی نہ ڈھونڈ لانے کی سزا زیادہ تھی۔ اتنے دنوں سے مسلسل یہ ہو رہا تھا کہ روز ایک نئی لڑکی

آتی۔ مگر اتنی بہت سی نئی لڑکیاں آخر آئیں کہاں سے؟ حیدرآباد دکن کا ایک بڑا مشہور سبزی ترکاری کا بازار تھا، جسے عرفِ عام میں "میر عالم کی منڈی" کہتے تھے۔ لڑکیوں کی بھی ایسی ہی کوئی منڈی ہوتی تو کیا بات تھی۔ بس گئے، پیسے دیے اور بیل گاڑی بھر لڑکیاں تلوا کر لے آئے۔ لیکن لڑکیاں تو جناب ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر حیلے بہانوں سے، روپے، پیسوں کا لالچ دے کر ہی لائی جا سکتی تھیں اور وہ بھی ایسی صورت میں جب اُن کا وجود ہو۔ جتنے پتے ٹھکانے معلوم تھے، وہاں کی خوب صورتیاں بستر کی زینت بنائی جا چکی تھیں۔ اور ادھر نواب صاحب کا جسم ٹوٹا جا رہا تھا۔ ناگنوں سے ڈسوانے کی ایسی لت لگ چکی تھی کہ گھر کی بیوی اب پھُس پھُسی معلوم ہونے لگی تھی، ویسے بھی وہ اس طرح سوچتے تھے :۔

"دُنیا کا اپنے عجیب غریب دستور ہے۔ کپڑا پُرانا ہوتا، دل سے اترتا، آپ کسی کو بھی دیدیتے۔ کوئی کچھ نئیں بولتا، جُوتی پُرانی ہو گئی، آپ پھینک دیتے یا دوسری خرید لیتے۔ کوئی کچھ نئیں بولتا۔ ایچ کھانا کھاتے کھاتے آپ کا دل بھر جاتا، آپ بول کو دوسری ہانڈی پکوا کیہ کھا لیتے۔ کوئی کچھ نئیں بولتا۔ ہور تو ہور میں سال کے سال ہاتھ کی گھڑی بدل دیتا۔ کوئی کچھ نئیں بولتا ــــــ پن آپ ذرا بیوی سے اکتا جاتے ہور چھوکری باندی سے دل بہلانا چاہتے تو ساری دنیا ناماں رکھتی۔ یہ دُنیا بڑی عجیب وغریب ہے۔" اور اس عجیب وغریب دُنیا کا چلن بدلنے اور نئی ریت قائم کرنے کے لئے ہی وہ روز ایک نئی تبدیلی کے خواہاں تھے اور آج کے غصّہ کی وجہ ہی یہ تھی کہ سرکار کا حکم تھا کوئی نوی چیز ہونا!"

پاؤں ذرا سمیٹ کر نواب صاحب نے ذرا نرمی سے پھر بات شروع کی۔

"ہوسے تو روپے پیسے کے مارے تو پیچھے نئیں ہٹ رہیا ــ؟"

اونگھتا ہوا کلوا ایک دم چوکنا ہو گیا۔ وہ کاروبار میں منجھ چکا تھا، سمجھ گیا۔ چوٹ لگانے کا وقت اور موقع یہی ہے۔ بظاہر بے پروائی سے بولا "جی ہو پاشا، آپ سچی سمجھے۔ مگر میں آپ سے اس واسطے نئیں بولا کی آپ نئیں تو سمجھتے کی میں اِچ خُرد بُرد کر دیا۔"

پھر ذرا رُک کر کہنے لگا "پاشا اُس کی ماں پچیس روپے کلدار مانگ رئی تھی۔"

بڑے سرکار ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئے "پچیس روپے؟ ایسی کون سی کوہ قاف کی پری ہے لُنڈے ـ؟"

کلوا پر جانے کے انداز سے بولا "جی ہو پاشا۔ کوہ قاف کی پری اِچ ہے لُنڈے نئیں پری ویسی نکلی تو کلیم الدین سے پلٹ کر میرا نام کلوا رکھ دینا" پھر ذرا آگے جُھک کر ادھر اُدھر دیکھ کر بے حد رازداری سے بولا "پاشا ــــ کبھی لال مٹی کا کورا برتن دیکھے آپ؟ پانی پڑتے اِچ کیسا سن سے بولتا! بس ایساچ کورا برتن سمجھ لیو پاشا ــــــ سن، سن ـ"

کچھ ایسے انداز سے کم بخت نے نقشہ کھینچا۔ بڑے سرکار کی رگ رگ سن سن کرنے لگی۔ تڑپ کر کھڑے ہو گئے، اچکن کی جیب سے کھن کھن گن کر پچیس روپے نکالے اور کلوا کی طرف اُچھال کر بولے "جا کو بس ابّی ابّی لے کو آ جا وہ چھوکری کو ــــ"

کلوا روپے دونوں مٹھیوں میں دبا کر تیزی سے نکلا اور برق رفتاری سے بھاگتا ہوا اپنے گھر پہنچ گیا۔

"سکو ــــ اے اوسکو! کان مر گئی؟" جواس باختہ سکینہ سامنے کے دالان میں نکل آئی ـــ "کائے کو اِتا چلاتے رئیں ـ"

"ئے کھانا کھائیں گی؟ مرغا، بریانی، ڈبل کا میٹھا، دہی کی چٹنی، کشمش

والے نان . . . . . .‘‘

’’چچ،چچ،چچ،‘‘ سکینہ افسوس سے بولی۔

’’بھوک کے مارے سچ مچ بھی تم پاگل دیوانے بن گئے۔ پن میں بھی کیا کروں؟ آج تو دال چاول کو بھی پیسے نئیں تھے۔ فاقہ اِچ سمجھو۔‘‘

’’اگے فاقہ نئیں ـــــ دعوت بول، دعوت۔ دیکھ یہ روپے۔‘‘ اور اُس نے روپے دالان میں اُچھال دیئے۔

سکینہ پاگلوں کی طرح روپیوں پر لپکنے لگی۔ ایک دم کلو اُسے دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر کہنے لگا۔ ’’بس پہلے ایک چھوٹا سا کام کر دے میرا۔ پھر یہ سارے روپے اپنے سال بھر کو پورے پڑ جاتے اِتّے تو۔

’’کیا کام ہے؟ جلدی بولو نا۔‘‘ سکینہ خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے بولی۔

کلو نے محراب میں ٹھونسے ہوئے کپڑوں میں جھٹ سے ایک ململ کا سفید کرتا نکالا اور اپنے ہاتھوں سے ہی سکینہ کے جسم پر سے میلا کرتا گھسیٹ کر اتارنا شروع کر دیا۔ وہ چلاّئی بھی: ’’اگے اگے! یہ کیا کرتے جی تم؟ بے شرم کدھر کے۔ کیا میرے کو کپڑا پہننا نئیں آتا؟‘‘ لیکن اتنی دیر میں کلو اُس کا کرتا اُتار کر قدرت کی صناعی کی داد دینے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

’’سکو ـــــ تو مال ہے ابھی تو مال ہے! تو بیس روپے کی کرچ لائق ہے۔ چل جلدی کر۔‘‘

پھر اُس نے مبہوت کھڑی سکو کو اپنے ہی ہاتھوں کرتا پہنایا دوپٹہ اٹھایا اور گھسیٹتا ہوا لے چلا۔

بڑے سرکار کی جو نظر اُٹھی تو اُٹھی ہی رہ گئی ـــــ غریبی جب ململ کا

کرتا کسی غریب کو پہنا دیتی ہے تو نوابوں کو بھکاری بنا دیتی ہے۔ بڑے سرکار ایک بھکاری کی طرح اُسے تکنے جا رہے تھے ـــــ گریبان تک جو بٹن پٹی لگی ہوئی تھی اس میں ہلکی سی گلٹ کی زنجیر میں بجنے والے بٹن جگمگا رہے تھے ـــــ اور زنجیر اور بٹن کے دائیں اور بائیں گلابی کوڑیوں میں جیسے پھر بھری رکھی تھی، جسے چاٹنے کیلئے بڑے سرکار بیقرار ہوتے جا رہے تھے۔ اُنہوں نے فاقہ زدوں کے انداز سے کلوا سے مڑ کر کہا "پچیس روپے تو بہوت ہی بہوت کم بولا تھا رے تو ـــــ پچیس روپے تو فقط اس بوسے دار کو پھینک دینا۔"

ردتی دھوتی سکینہ باہر نکلی تو کلوا وہیں جھاڑیوں میں دُبکا بیٹھا تھا اُسے دیکھ کر وہ تیزی سے اُٹھا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بھگاتے ہوئے ڈیوڑھی سے باہر لے آیا۔ ایک ہاتھ سے رکشا روک کر اُس نے نامپلی اسٹیشن کے ایک بڑے سے ہوٹل کا پتہ دیا جو رات گئے تک کھلا رہتا تھا۔

کرسی پر بیٹھتے ہی اُس نے مرغ، بریانی، میٹھے، دہی کی چٹنی، نان ایک سے ایک بڑھیا چیز کا آرڈر دے ڈالا۔ بیرا ایک ایک چیز لا کر چنتا گیا۔ اب پہلی بار اُس نے نظریں چُرا کر سکینہ کی طرف دیکھا۔

"رونے کو تو ساری رات پڑی ہے، بلکہ ساری زندگی پڑی ہے رے۔ ذرا اُس سے پہلے پیٹ بھر کو کھانا تو کھا لے۔ تیری آج تو کمائی ہے۔"

سکینہ نے پہلے تو اپنے شوہر کی طرف دیکھا، پھر پاس پڑا ہوا چمچہ اُٹھا کر تڑاتڑ زور زور سے اس کے سر پر مارنا شروع کیا۔

"ارے ارے ـــــ یہ کیا کرتی رے؟ آگے دیکھنا تو کب سے مرغے کی خوشبو بھی نئیں سونگھی ہوتیں گی۔ بریانی کا مزہ کیسا ہوتا، یہ بھی تیرے کو یاد نئیں

ریا ہوتیں گا ـــــ پر اب دیکھنا، دیکھ، دیکھ! کیسا بہوت سا کیتا مزے دار کھانا ہے۔ تو بھی تو صبو سے بھوکی اِچ تھی نا؟"

چچہ چھوڑکر سکینہ نے کھانے کی طرف دیکھا اور اس کی بھوک اُسے ڈسنے لگی۔ اُس نے دیوانوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے مونہہ میں بیک وقت کئی کئی چیزیں ٹھونسنی شروع کر دیں۔

کلوا کا پروگرام سوچا سمجھا تھا۔ سال بھر کی تنخواہ ایک ہی ساتھ مل گئی تھی بیوی کی عزت گئی اس کا اُسے دُکھ ضرور تھا۔ لیکن سوکھے پیٹ نے اُسے جواز بھی سمجھا دیا تھا۔

"اِتنے زمانے سے میرے ساتھ سوتی تھی۔ بس ایک رات بڈھے سرکار کے ساتھ سو گئی تو کون ہیرے موتی جھڑ گئے ـــــ بات تو ایک اِچ ہوئی نا! سرکار کے ساتھ سونے سے کم سے کم سال بھر کی تنخواہ ایک ساتھ تو مل گئی!"

اب اُس نے یہ سوچا تھا کہ چپکے سے نکل کر سکینہ کو ساتھ لے کر ماں باپ کے پاس اضلاع میں چلا جائے گا اور باقی زندگی کھیتی کے کام کاج میں چین اور عزت سے گذارے گا۔ روز روز کی لاتیں اب اُس سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔

دو دن تیاری میں نکل گئے۔ ان دو دنوں میں وہ ڈیوڑھی ہی نہیں گیا۔ اور جانے کی اب ضرورت بھی کیا تھی؟ اپنے حسابوں تو اُس نے نوکری چھوڑ دی تھی۔ لیکن ادھر نواب صاحب کو پہلی دھار کی طرح چڑھ گئی تھی۔ لڑکی اُتمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ دو دن تو اسی انتظار میں نکل گئے کہ کلوا آئے تو پھر اسی کوری لال مٹی کی صراحی کو بلوائیں، مگر جب کلوا پلٹا ہی نہیں تو

بڑے سرکار خود ہی شکرم لگواکر اُس کے گھر پہونچ گئے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ دو دن سے کلوا نہیں آیا، تو وہ خیریت پوچھنے آئے ہیں۔

کلوا اُس وقت کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا۔ گھر میں صرف سکینہ تھی، نواب اقتدار یار جنگ کا کلوا ایسے حقیر فقیر کی مڑگی (جھونپڑی) تک آجانا ایسی کوئی معمولی بات تو تھی نہیں، سارے محلے میں شور مچ گیا۔

" اگے ایک بہوت بی بہوت خوبصورت بڑی بھاری شکرم آئی گے کوئی نواب صاحب آئے کتے ــــــ"

سکینہ بھی تیزی سے باہر نکلی۔ نواب صاحب سے اُس کی آنکھیں چار ہوئیں ــــــ نواب صاحب کا دل اُچھل کر سینے سے باہر نکلنے لگا۔ جس کے لئے وہ یوں تڑپ رہے تھے وہ اس قدر آسانی سے مل جائے گی، اس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔ مگر رعب داب قائم رکھنے کی خاطر پوچھا "کلوا کا گھر کون سا ہے؟"

"یہی اِچ ہے سرکار" کئی آدمی ایک ساتھ بولے۔

" تو اُس کے گھر یہ چھوکری کون کھڑی ؟"

" یہ ؟ اِنے تو اس کی مکان والی (بیوی) ہوتی سرکار"

نواب صاحب کبھی سکینہ کو دیکھتے، کبھی محلے والوں کو۔ دل میں غصّہ کا اُبال سا اُٹھا" تو اُنے حرام زادہ، سُور کا جنا ہم کو دھوکا دیا۔ پورے پچیس۲۵ روپے کا دھوکا ــــــ" اچھا بچہ جی" ــــــ وہ سکینہ سے مخاطب ہو کر بولے۔ " یہ ہمارا چاؤس تمہارے گھر پو بیٹھا رہے گا۔ کلوا آتے تو اس کو فوراً ڈیوڑھی پو بھیج دیو"

کلوا بیدِ مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ جب زبان پہ بید پہ بید پڑ رہے

ہوں تو اچھے اچھے بھی بید مجنوں کی طرح کانپنے لگتے ہیں اور وہ تو تھا ہی تیمچی کی طــرح ۔

"کیوں بے حرام کی اولاد ــــــ جب اپنے گھر کی آپس کی ایچ بات تھی تو تو میرے سے روپے کیوں لیا ـ؟ اِتی خوبصورت تیری بیوی تھی تو تیرا کام نئیں تھا کی ویسا چ لا کو پیش کردیتا ۔ کیا میرا نمک نئیں کھاتا تھا تو؟"

کلوا کچھ نہ بولا ۔

"اب تیری سزا یہ ہے کہ دہ پورے روپے میرے کو واپس کر ۔ ہور سزا کے طور پر ایک مہینہ روزانہ اپنی بیوی کو میرے پاس بھجوا ۔"

کلوا کچھ نہ بولا ۔

"ہور سُن ــــ تیری ایک سزا یہ بھی ہے کہ جب ہم ہور تیری جورو اندر رہیں تو تو دروازے پو ہی بیٹھا رہو ــــــ پھر تیرا جی تو جلنا کی اندر تیری جورو کا کیا حشر ہو رہا ۔"

کلوا کچھ نہ بولا ۔

پھر سرکار نے کھانا کھلانے والے خادم کو بلا کر زوردار الفاظ میں تنبیہہ کی :

"اب سے ہماری جھوٹن اس حرام زادے کو نکو دیتے جاؤ ۔ بہوت حرام خور ہے اپنے ۔ کھا کھا کو مستی چڑھ گئی اِس کو ۔"

خوف کی زیادتی کبھی کبھــار انسان کو بے خوف بنا دیتی ہے ۔ اب کلوا پہلی بار بولا : ــــــ "ہو، آج سے میں ایچ کانہ کی جھوٹن نئیں کھاؤں گا ، کیوں کہ اب تو سرکار میری جھوٹن کھا رئے ہے ۔"

بڑے سرکار کے ہاتھ سے بید چھوٹ کر اُن کے اپنے پیروں پر آ پڑا ۔

ٹھکانا

"پاشا' میں بہوت پریشان ہو کو یہ فون کر ری ئی ۔" صنوبر کی کانپتی آواز دُور سے سنائی دی ۔ "آپ کی بلّی صبح سے کچھ کھا پی نئیں ری ئی ۔" اس نے اٹکتے اٹکتے بات پوری کی ۔

"اللہ میں مر گیا!" رضیہ بانو، نواب اقتدار جنگ کی اکلوتی لڑکی — کانونٹ کی پڑھی ہوئی — جیسے حیدر آباد کے عام اُمراء کی لڑکیوں کی طرح لڑکوں کے انداز میں بات کرنیکا کریز تھا، فون میں منہ گھسیڑ کر تقریباً چلاّتی ہوئی بولی "ہو تم لوگاں کیا پانواں میں مہندی لگالے کو بیٹھیں کیا؟ بیتا کو بول کے ڈاکٹر کو ذرا فون کر دیو ۔" پھر وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پیچھے مُڑی اور اپنی عزیز از جان سہیلی روشن سے رونکھی ہو کر بولی ۔ "اللہ روشن، بنّی کو کچھ ہو ہوا گیا تو میں

میں مرجاؤں گا ۔"

"اللہ نکو ریزی اتی پریشان نکو ہو ۔" روشن آرا (وہ بیک وقت خالہ کی بیٹی بھی تھی اور سہیلی بھی ، اور دونوں ہی کو کانونٹ میں پڑھ پڑھ کر بات بات میں انگریزی بولنے اور ناموں کو "انگریزیت" میں ڈھالنے کا شوق تھا ، رضیہ کو ریزی اور روشن آرا کو روشی کہلوانے کا خبط) فون کے پاس آکر بولی ۔" تو بولنا پپا سے لائن ملا دیو ۔"

"نئیں اللہ روشی ! تو نئیں سمجھتی ، پپا سے فون ملانا خیامت سے خیامت انوں لیکچراں شروع کر دیں گے ۔۔۔ صبح ناشتے میں کیا کھائے ؟ دوپہر میں کیا پیئے ؟ سہ پہر کو سوئے کہ نئیں ؟ چار بجے کہیں چائے تو نہیں پی لئے ؟ تحقیقات کرتی ہے ۔ نکو بابا ، ایک جھنجٹ ہے کوئی ۔ پھر وہ چونک کر فون کی طرف دوبارہ متوجہ ہو گئی ۔ "اللہ صنوبر ، میں خود آتا ہوں ۔"

اچانک بلی کے دودھ نہ پینے سے پکنک والے پروگرام کا کیسا ستیاناس ہو رہا تھا ! لیکن کیا کیا جا سکتا تھا ؟ بلی آخر رضیہ بانو کی بلی تھی ، روشن آرا بھی مجبور تھی ۔۔۔ دو دن سے رضیہ بانو اپنی خالہ کی حویلی میں محض ہلڑ بازی مچانے آئی ہوئی تھیں ۔ کیونکہ چند روز بعد تو ان کی شادی ہونے والی تھی ، پھر یہ فراغت کے دن رات کہاں نصیب ہونے والے تھے ۔ پھر تو وہ خالص "بیگمات" بن جانے والی تھیں ، ۔۔۔ بڑے تخت پر شاندار تخت پوش بچھا ہوا ۔ سامنے سونے کا پاندان ، تخت سے نیچے چاندی کی سلفچی ، اُگال دان ، پان بنا کر نواب صاحب کو دے رہی ہیں ۔ خود کھا رہی ہیں ، حویلی کے بارے میں احکامات صادر کر رہی ہیں اُفوہ ! شادی کے بعد کس قدر ذمہ داریاں گلے پڑ جاتی ہیں ۔ آئے دن کی دعوتیں ، ٹھنڈ

کرو۔ پھر اپنے گھر پہ ہونے والی دعوتوں کے سلسلے میں حیثیت کھول کر بار بار رشتے نکال کر دو۔ کاموں کی انتہا ہے کوئی! ایسی ذمہ دارانہ زندگی اپنانے سے پہلے چند دن ساتھ کی ہم عمر سکھی سہیلیوں میں کھیل کود کر گزار لئے جائیں، تو کیا ہی اچھی بات ہے۔ لیکن قسمت میں ہو تب نا۔ ورنہ یہ بیٹھے بٹھائے بلی کیوں بیمار پڑ جاتی۔؟

پردے لگی ہوئی سیاہ فورڈ میں سے دونوں سہیلیاں حواس باختہ اتریں اور سیدھی زنان خانے کی طرف لپکیں۔ اب پپا حضور سے ملاقات کرنا کتنا ضروری حکم سہی، لیکن بلی۔!

چاندی کی پلنگڑی پر اعلیٰ گلابی قسم کے مخملیں شنائل کے گدے پر بلی سست پڑی تھی۔ بالوں دار لمبی دُم پیٹ کے نیچے دبائے ہوئے، مالکن کے پیروں کی چاپ اور مانوس خوشبو سونگھ کر اس نے بڑی اداسی بیزاری سے ذرا کی ذرا سر ہلایا۔ اور گلے میں پڑے ہوئے سونے کے گھنگھرو مدھم سروں میں چھن چھنائے

"اللہ کیا ہو گیا جی میری جان کو" رضیہ بانو نے لپک کر روئیں دار بلی کو، بازوؤں میں دبوچ لیا۔ ننھی پاشا کے غم میں پوری ڈیوڑھی شریک ہونا چاہتی تھی اسی مارے ان کے پیچھے ایک جم غفیر آ کھڑا ہوا تھا۔

"پپا ڈاکٹر کو فون کرے کی نئیں؟" اس نے گھوم کر جملہ حاضرین سے ایک سوال کیا۔

"ایک موٹر رکنے کی آواز آئی تو تھی۔ شائد ڈاکٹر صاحب اچ ہوئیں گے پن پردے کی وجہ سے شائد اُدھرچ بیٹھے ہوئے ہیں گے۔"

"پڑے جھرٹے کو مار د گولی جی! جلدی سے بلا کو لاؤ۔۔۔۔۔"

لیکن اسی دم لکھنؤ والی نفیس باورچن، جو ڈیوڑھی میں محض ایک بریانی پکانے پر مامور تھیں، قدرے الجھ کر بولیں "اے موئے ڈاکٹر کیا کریں گے بھئی۔ وہ ہم بریانی کے لئے گوشت لئے بیٹھے تھے کہ بنکی بیگم آگئیں اور اتنا نہ اتنا پورا ایک تول سے تین پاؤ گوشت کھا گئیں ـــ اب اتنا کچھ کھا لیا تو سست نہ پڑیں گی تو کیا ناچتی پھریں گی۔؟"

رضیہ بانو کا موڈ بری طرح آف ہو گیا۔ جھلا کر بولیں "تو ماما بی، تم نے ہماری بلی کو بکرے کا گوشت کھلا ڈالے، تم کو اتا بھی نہیں معلوم کی اُنے روزانہ ایک مرغی کھاتی ہے۔ وئی تو میں بھی سوچ رہا تھا کہ اننے کائے سے ایسے سست ہو گئی۔"

" یہ حیدرآباد دکن ہے، پیارے مسعود

یہ نوابوں، رئیس زادوں، کی بستی ہے۔ یہاں یا تو انتہائی امیر لوگ بسے ہوئے ہیں، یا انتہائی غریب، بلندیوں اور پستیوں کا ایسا عجیب و غریب امتزاج میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔ ہم لوگ بھی یہاں کے امراء اور رؤسا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ دہلی سے آکر ہم لوگ یہیں کے ہو گئے ہیں۔ یہاں آکر ہمیں سب کچھ مل گیا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں کھوٹے کھوٹے پن کا احساس جی کو ڈستا رہتا ہے ابا میاں حضور نظام کے دربار میں اتنی بڑی جائداد پر مامور کئے گئے ہیں کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ پھاوڑے اور کدالیاں لگوا کر بھی ہم یہ دولت پھنکوانا چاہیں تو نہیں پھنکوا پائیں گے ـــ ہاں اب ہمارے یہاں کے چھوٹے بچوں کی تعلیم مزے میں ہو رہی ہے۔ کانونٹ میں انگلش ٹیچر سے پڑھتے ہیں۔ گھر پہ استانی ماں اردو

سکھاتی ہیں۔ اور جغرافیہ تاریخ۔ حساب الگ سے پڑھاتی ہیں۔ مولوی صاحب مذہبی تعلیم کے لئے رکھے گئے ہیں۔۔۔۔

مگر یار یہ برسوں بعد تمہیں میرا خیال کیسے آگیا اور میرا حال پوچھنے کی ضرورت کیسے پڑ گئی۔؟

شادی؟ ہاں وہ جلد ہی ہونے والی ہے۔ یہاں ابا میاں کے گہرے دوستوں میں سے ایک نواب اقتدار جنگ ہیں۔ ان کی ایک ہی صاحبزادی ہیں۔ سُنا ہے (دیکھا نہیں) بڑی ہی خوبصورت اور فارورڈ ہیں۔ ایک آدھ جھلک دیکھ لینے کا (شادی سے پہلے) ارادہ ضرور ہے کیونکہ یار سُنا ہے کہ یہاں کی نواب زادیاں بڑی خوبصورت سہی، مگر نک چڑھی بھی ہوتی ہیں۔ اگر صورت سے ایسا ویسا کچھ اندازہ ہو گیا تو میں کسی نہ کسی بہانے گول کر جاؤں گا۔ لیکن اصل مصیبت یہ ہے کہ دوست کہ نواب اقتدار جنگ کے ہاں اس قدر شدید پردہ ہے کہ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ موٹروں میں موٹے موٹے ریشمی پردے لگے ہوئے ہیں۔ امی جان نے لڑکی۔۔۔ میرا مطلب ہے رضیہ بانو کو ایک محفل میں دیکھا، پسند کیا اور میرے لئے چُن لیا۔ میں تو خیر میں ہی ہوں، حد یہ ہے کہ ابا میاں بھی ہونے والی بہو کو نہیں دیکھ سکتے۔ سات پردوں میں رہنے والی روایتی شہزادی سے گویا ہماری شادی ہو رہی ہے۔۔۔

بہر حال تم شادی میں ضرور شامل ہونا۔۔۔ رقعے تو مل ہی جائیں گے لیکن میری طرف سے تمہیں ذاتی طور پر خصوصی دعوت۔

ارے ہاں، میں نے شائد تمہیں نہیں بتایا کہ میں نے اکنامکس میں ایم اے کر لیا ہے۔۔۔ اور یار مسعود، تم آج کل کیا کر رہے ہو۔ کبھی تو دلی سے باہر نکلو

شادی کے دعوتی رقعے کا انتظار کرو ـــــ

تمہارا فیروز"

کیا ہی یادگار شادی تھی، کچھ پوچھئے نہیں ـــــ نواب اقتدار جنگ نے
کروپیہ، جس کے ہاں پانی سے بھی گیا گزرا تھا، اس شادی میں ایک اور ہی جدت
تھی - مہمانوں کے لئے جو مہمان خانے اور گھر سجائے جاتے ہیں - نواب کے سے
انھوں نے یہ کیا کہ ہر مہمان خانے میں ایک ایک حسین سے حسین ترین رقاصہ کا بھی
انتظام کیا ـــــ رقاصہ جو ناچے بھی، گائے بھی اور رات پڑنے پر سیج بھی سجائے
اب یہ بھی ظاہر ہے کہ سب ہی مہمان تو کنوارے نہیں تھے ۔ کئی بال بچوں، بیویوں والے بھی
تھے - ایسی دھاں دھوں مچی کہ بس، اب کون اُلّو کا پٹھا تھا کہ تر نوالہ سامنے دیکھے اور
منہ پھیرلے ـــ اور کئی بیویوں نے اپنے شوہروں سے فارغ خطی لے لی اور کئی نوابوں
نے تو اپنی بیگمات کو کھڑے کھڑے تین طلاقیں دے دیں ـــ اور ان ہی رقاصاؤں کو
گھر ڈال لیا - ایک محتاط اندازے کے مطابق اس شادی کے انتظام پر کوئی نوّے
لاکھ روپیہ اُٹھا تھا ۔ ستّر تو رقاصائیں مہیا کی گئی تھیں ـ جو ایک ایک رات کا ایک
ہزار روپیہ نقد گنوا لیتی تھیں ۔ اور کئی دن پہلے سے یہ سارا انتظام شروع ہو گیا تھا
نواب اقتدار جنگ کے لئے سب سے زیادہ غرور کرنے کا لمحہ وہ تھا جب
فرماں روائے دکن میر عثمان علیخان نے اس شادی میں شرکت کرنے کا وعدہ فرمایا -
لیکن نواب اقتدار جنگ کہ واقعی پرکھوں کے نواب تھے اور بات کے
پکّے اور ضد کے پورے، ایک ہی چھوٹی سی بات پر اَڑ گئے اور کوئی یقین کرے نہ کرے
حیدرآباد دکن کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی ہوا کہ محض بیٹی کی ایک جھلک دیکھ لینے کی
پاداش میں ہونے والے داماد کو چھٹی کر دی گئی، اور ایک کروڑ روپیہ جو شادی کے

انتظامات، جوڑ، جماؤ، جہیز وان کے سلسلے خرچ ہوا تھا۔ "اونہہ" کہہ کر ٹھلا دیا گیا بات کچھ بھی نہ تھی۔ جس دن رضیہ بانو مایئوں بٹھائی گئیں تو ایسی پیاری اور حسین نظر آرہی تھیں کہ روایتی کوہ قاف کی پریوں کا حسن بھی ان کے سامنے ماند! ہلدی کی رسم کے لئے جب دولہا والے بڑی ڈیوڑھی میں آئے تو کسی نے دولہا سے کہہ دیا کہ "دلہن نے وہ روپ نکالا ہے کہ بس دیکھو تو جل کر رہ جاؤ، خاک ہو جاؤ۔"

کچھ تو جوانی کا جوش اور کچھ ہر ہونے والے دولہا کی سی شدید بے تابی اور چلبلاہٹ ـــــ جس کمرے میں رضیہ بانو مایئوں بٹھائی گئی تھیں، اس کے پچھلی طرف والی بڑی کھڑکی کے چھجے پر چڑھ کر انھوں نے چپکے سے کل اپنی ہو جانے والی دلہن کی ایک جھلک بھی نہ دیکھی ہو گی کہ اتفاقاً کسی کام سے نواب اقتدار جنگ کا اُدھر سے گذر ہوا۔ اور وہ جیسے دہک اُٹھے۔

"مانا کہ کل دلہن ان کی ہو جائے گی لیکن آج تو غیر محرم ہیں۔ یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔" اور انھوں نے اتنی آسانی سے یہ رشتہ توڑ دیا۔ کہ کوئی دھاگے کو بھی ایسے نہیں توڑتا۔

رضیہ بانو سات پردوں میں رہنے والی شہزادی! غم نہ کرو۔ کیا تمہیں بر نہیں جُڑے گا۔؟ لیکن باپوں کی ضدوں پر ایسی قربانیاں کہاں تک جائز ہیں۔؟ وقت گزر رہا ہے ـــ گزر رہا ہے۔ گزرتا جائے گا۔ اس ڈیوڑھی کی دیواریں۔ کھوکھلی ہو رہی ہیں ـــ میں تمہارا آئینہ ہوں ـــ تمہارا عکس، تمہارے دل کی بات' جاننے، پہچاننے والا: بچپن، کے نوخیز امنگوں کے چھیڑ، چھیڑ، اڑ کھیل کود کے دن گئے ـــ اور ساتھ ہی وہ دن بھی لد گئے، جب بلیاں سونے

کے گھنگروں پہن کر، چاندی کی پلنگڑیوں پہ سوتی تھیں اور چاندی کی کٹوریوں میں میوے والا دودھ پیتی تھیں ــــ اور جن کے لنچ میں روزانہ ایک مرغی ذبح کی جاتی تھی ــــ اب پولیس ایکشن ہو چکا ہے۔ یہ تمہارا میرا جنت نشان حیدرآباد دکن، جہاں کی سڑکوں پر حضور نظام کی موٹر گاڑی نکلتی تھی تو سارے میں سناٹا پھیل جاتا اور تیز تیز سیٹیوں کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا کہ ہر راہ گیر سڑک چھوڑ کر فٹ پاتھ پہ ہو جائے۔ اور دوسری گاڑیاں اور سواریاں تیز تیز راہ چھوڑ کر نکل جائیں یا ایک طرف ہو کر کھڑی ہو جائیں۔ اب دھیرے دھیرے اپنی عظمت کے نقوش کھو رہا ہے۔ یہ بہت دن تمہیں گلے لگا کر نہ رکھ سکے گا۔ بھاگ جاؤ۔ کہیں بھی منہ چھپا لو ــــ ایسا نہ ہو کہ آنے والا وقت تمہارے سرکش سر کو جھکا دے!

بڑی بیگم کا جنازہ صحن کے بیچوں بیچ رکھا ہوا تھا۔ زمینداری، جاگیرداری اور نوابی ٹھاٹ کے خاتمے کی خبر سنتے ہی ان کا دم یوں نکل گیا جیسے غبارے سے محض ایک سوئی کی نوک چبھ جانے سے ہوا نکل جاتی ہے۔ نواب اقتدار جنگ سخت دل سخت جان تھے، ان پر اس خبر سے کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ انھوں نے بے پروائی سے کہا "اخباروں کو نئی نئی خبریں روز ہی چاہئیں۔ لو آج یہی خبر سہی"

لیکن بیگم صاحبہ کی موت نے انھیں بھی ہلا کر رکھ دیا ــــ تو گویا اب رضیہ بانو کی پوری پوری ذمہ داری ان ہی کے سر آپڑی۔ رضیہ بانو کی شادی کروانے کے بعد کئی پیغام اس کے لئے آئے۔ لیکن انھیں ہر پیام میں کوئی نہ کوئی نقص نظر آتا گیا۔ بیگم صاحبہ جھلا کر کہہ اٹھتیں ــــ "اب سارے حیدرآباد میں اچ کیڑے

پڑ گئے تو کوئی آسمان کا تارا توڑ کر لائے بیٹی کے واسطے۔"

"وہ بھی ہو جائیں گا۔" وہ ہنس کر کہتے۔

لیکن آج وہ سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ چلتی تو ان ہی کی تھی، لیکن ایک احساس کسی کی دوسراہٹ کا، سکھ دکھ بانٹ لینے کا احساس۔ آج سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ وقت کیسے بدل جاتا ہے خداوند!

"کہو میاں کیسے آئے؟ کہاں سے آئے۔؟" شبیر میاں کو دیکھ کر نواب اقتدار جنگ بولے۔

"جی شادی سے آ رہا ہوں۔" شبیر میاں نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کس کی شادی بھئی؟" نواب صاحب ذرا مسکرائے۔

"وہ تو مجھے خود بھی پتہ نہیں۔"

"پھر؟" نواب صاحب نے حیرت سے کہا۔ "رقعے پر کسی کا تو نام نشان ہوئیں گا۔؟"

"یہاں رقعہ وقعہ نہیں چلتا تایا آبا۔ اپن تو جہاں بھی شادی دیکھتے ہیں جا دھمکتے ہیں۔"

جب سے زمیں داری اور نوابی ختم ہوئی تھی، اور ایک ایک کر کے سارے ٹھاٹ باٹ رخصت ہو گئے تھے۔ اور وثیقہ ملنے لگا تھا۔ جو کہ دونوں گھرانوں کا برائے نام ہی تھا، ان شبیر میاں نے یہی دھندا شروع کر رکھا تھا۔ (اس طرح کھانے پینے کی بڑی فراوانی رہتی تھی) سر شام ہی سے وہ گھر سے نکل جاتے، راستے میں جہاں بھی کہیں ہنڈے سے دھوم دھڑکا دیکھتے، فوراً براتی بن کر پہنچ جاتے۔ سیدھے دولہا کے پاس جا کر پہلے تو "مبارک ہو جناب" کا نعرہ لگاتے اور پھر ایک دم گلے سے

لپٹ جاتے ۔ اب دولہا والے یہ سمجھتے کہ دولہن والوں کی طرف سے ہوں گے جب ہی بے تکلفی کا یہ عالم ہے کہ آتے ہی دولہا سے لپٹ پڑے ۔ اس طرح دونوں طرف سے ان کی آؤ بھگت اور خاطر مدارات ہوتی کہ دو دن بعد بھی کھانا نہ ملتا تو پروا نہ ہوتی ۔

شادیوں کے سیزن میں ان کی خوب موج ہو جاتی ۔ ویسے خاصے پڑھے لکھے تھے، لیکن حالات نے کمر توڑ دی تھی ۔ طبیعت میں ہنسی مذاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ۔ تھوڑی پامسٹری بھی سیکھ رکھی تھی ۔ کسی نہ کسی کا ہاتھ دیکھتے رہتے خوش کرنے کی باتیں زیادہ بتاتے، کچھ دل سے بھی جوڑ دیتے ۔ بُری باتیں صفا گول کر جاتے ـــ رضیہ بانو کا ہاتھ دیکھ کر اُسے بہت دلاسہ دیا تھا " گھبراؤ نہیں بچی ـــ تیرا مستقبل بے حد شاندار ہے ۔ بے حد پیسہ آئے گا تیرے ہاتھ میں۔" اُدھر جب سے جاگیرداری چھِنی تھی، بس دو وقت کی روٹی کے بھی لالے تھے ۔ نام نہاد بڑے پن کی لالچ میں جو ایک کروڑ روپے کا بھٹکا کمر پر پڑا تھا ۔ اس نے آگے ہی کھوکھلا کر دیا تھا ۔ اوپر سے زمینات بھی چھِن گئیں ۔ رہا سہا اثاثہ کتنے کتنے دن کام آتا ۔ ؟ ایک ایک کر کے، گھر دکانیں اور جو کچھ بھی جائداد تھی بکتی رہی ۔ نوبت گھر کے زیور پر آ کر ٹوٹی ۔ بیٹا کوئی تھا نہیں کہ نوکری کر کے آسرا بنتا، بیٹی کیا کرتی ـــ ؟ خود بوڑھے ہو گئے تھے ۔ اور زمانے کی مار نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا ۔ ایسے حالات میں امید افزا دنوں کا ہلکا سا تصور بھی دل کو خوش کر دیتا ہے ۔ لیکن رضیہ بانو نے ہاتھ چھڑا کر بہت گہرے دکھ کے ساتھ کہا ۔" شبیر بھائی ـــ خواہ مخواہ زخموں کو مت کھُرچو ـــ آپ کو معلوم نہیں حالات کیا ہیں ۔ یا پھر میرے کو اُلّو بنا لے رئیں ـــ

اب کیا کبھی ہم ایسا سوچ بھی سکتیں کی ہمارے پاس پیسہ آ ئیں گا ۔؟ اور اس نے سرخجھکا کر آنسو پونچھے تو شبیر میاں لرز کر رہ گئے ـــ بے چارے کے سر میں یہاں وہاں سفید بال نظر آ رہے تھے ـــ بال سفید ہونے کی تو یہ عمر نہ تھی !

وہ بڑا بھیانک دن تھا ۔ جس مہاجن کے پاس یہ کوٹھی رہن تھی ، جس میں وہ آج تک رہتے آئے تھے ۔ وہ سارے کاغذات لے آیا تھا ، ڈیوڑھی کا سامان تو ایک ایک کر کے بک ہی چکا تھا ۔ اب خالی ڈھنڈار کوٹھی میں رکھا ہی کیا تھا ۔ عزّت سادات اسی میں تھی کہ تھوڑے سے بہت روپے جو بھی اس نے ہتھیلی پر رکھ دیئے ۔ چپکے سے لے لیں ۔ اور ڈیوڑھی خالی کر دیں ۔

دو دن کی مہلت مہاجن سے مانگی تھی ، جو اس نے ازراہ رواداری دے دی تھی ۔ اپنے ایک ملنے والے کے توسّط سے پرانے حیدرآباد کے ایک سستے محلّے "پنچھی براق" میں ایک چھوٹا سا مکان مل گیا ۔ چند گنتی کے برتنوں اور ایک بستر بیٹی کے ساتھ جب دونوں باپ بیٹی اپنے نوکروں سے بھی گئے گزرے مکان میں اُترے تو ایک رکشا والے نے دوسرے رکشا والے کو آنکھ ماری ۔

"نیا مال ہے سالے ـــ دیکھتا کیا ہے ؟"

رضیہ بانو لرز کر رہ گئی ـــ قسمت نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ۔ حالات تو سب ہی کے بدلے تھے ، لیکن سب کے پاس جذبات کے ساتھ ساتھ عقل بھی تھی ـــ پپا کے پاس نرے جذبات ہی جذبات تھے ۔ جنھوں نے اپنے وطن عزیز کی مٹی کو آسمان جانا ، اور کہیں جانے کے بارے میں بھول کر سوچا نہیں ۔ ان کے کتنے سارے عزیز آج پاکستان میں تھے ۔ اور کچھ تو کلیم میں جائداد حاصل کر کے اور کچھ

چار سو بیسی کرکے آج بھی راج کر رہے تھے ۔ لیکن بپا تھے جنھوں نے ہر موقع پر صرف اپنی ہی ہٹ چلائی تھی ۔

" بپا ! " رضیہ بانو دکھ سے بولی ۔ " آج چاول بالکل ختم ہوگئے ہور.... "
اس نے رُکتے رکتے کہا ۔ " دال بھی ۔ اللہ بپا ! " وہ سسک کر بولی " ہم لوگاں بہوت گناہ کرے تھے کیا ؟ "

" ٹھیرو بی بی ۔ " وہ اُٹھے ۔ دروازے تک گئے ۔ ہاتھ زندگی بھر اٹھا ہی رہا تھا ۔ مگر دینے کے لئے ، لینے کے لئے ہاتھ کیسے اُٹھاتے ؟ کچھ دیر سوچا کئے ۔ کیسے آواز لگائیں ۔ ؟ کس سے بھیک مانگیں ؟ پھر ایک خیال آیا انھیں ۔ چاندی کا وہ کٹورا آج تک ان کے ساتھ تھا جس سے سہاگ رات کو باری باری میاں بیوی نے ایک ایک گھونٹ کرکے دودھ پیا تھا ۔ سوچا اسے دروازے کے سامنے ایک کپڑا پھیلا کر رکھ دیں ۔ جو بھی رحم دل ہوگا ، سمجھ لے گا ۔ غیرت مند فقیر ہے ، خیرات کے لئے رکھا ہوگا ۔ کچھ نہ کچھ ڈال ہی دے گا ۔ ایک کپڑے پر کٹورا رکھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ گھر میں آ گئے ۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد جا کر جھانکتے کہ شائد کسی نے کچھ ڈال دیا ہو ہر بار مایوسی ہوتی ۔ تھوڑی دیر بعد پھر گئے تو کٹورا ہی غائب تھا ۔! اگر یہ انجام معلوم ہوتا تو کچھ رپیے چاندی بیچ کر ہی بنا لیتے ۔ مگر جذبات ! بی بی کی چیز سے جو لگاؤ گہرا تھا ، وہ نہیں بیچنے دیتا !

اک دم وہ بیٹی کو گلے لگا کر چیخ چیخ کر رو پڑے ۔ " بٹیا ۔ میں تمہاری زندگی تباہ کر دیا ۔ اللہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گا ۔ روزانہ راتوں کو میں دعائیں مانگ

مانگ کر رو رہا ہوں ۔ کہ اللہ تو میرے قصور معاف کر دے ۔ میری بچی کے نصیب کھول دے ۔ مگر ایسا لگتا بٹیا کہ اللہ بھی ہم سے ناراض ہو گیا ہے ۔ بٹیا میں تو کیسا بھی کر کے بھیک مانگ کر بھی جی لے سکتا ہوں، پر بٹیا تم ۔ تمہارا کیا ہوئیگا؟"
پھر وہ بلک بلک کر رونے لگے ۔ " اللہ میری بیٹی کو کسی ٹھکانے سے لگا دے معبود ــــ "

دو دن گزر چکے تھے، گھر میں کچھ تھا بھی نہیں ۔ پکا بھی نہیں ۔ رضیہ بانو اپنے چھوٹے سے بوسیدہ مکان کی کھڑکی میں بے رنگ بے مقصد لگا ہوا سے سڑک کو گھور رہی تھی ۔ کہ نیچے سے اک رکشا والا اُسے دیکھ کر مسکرایا ۔
رضیہ نے اسے دیکھا تک نہیں ۔ کھڑکی سے ہٹی بھی نہیں ۔ رکشا والا سمجھا بات بن گئی وہ زور زور سے پیڈل مارتا ہوا چلا گیا ۔
رات کے کوئی گیارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی ۔ نواب اقتدار جنگ، دروازے پر گئے تو رکشا والا، رازداری سے بولا
" بائی جی ہیں ؟"
" بائی جی ؟" نواب صاحب کا دل دھڑکا ۔ وہ مونہہ سے کچھ کہہ بھی نہ پائے تھے کہ رکشا والا بول اٹھا " موٹی اسامی ہے ۔ ہاں ۔"
نواب صاحب کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت ختم ہو چکی تھی ــــ بے جان سے پتلے کی طرح وہ راستے سے ہٹ گئے " موٹی اسامی " جواب تک رکشا ہی میں بیٹھی ہوئی تھی، رکشا والے کا اشارہ پاکر اُتری، ــ اندھیرے میں کچھ کھسر پھسر ہوئی، رکشا والے نے اپنا کرایہ، اپنا " محنتانہ " لیا اور اندھیرے میں

رکشا کو ہاتھوں ہی میں پکڑے پکڑے کھو گیا

جب وہ ـــ ہاں وہی جو سات پردوں میں رہتی تھی جس کی ایک جھلک بھی اس کا اپنا ہونے والا شوہر تک نہیں دیکھ سکتا تھا، جب وہ حالات ـــ کے ہاتھوں بک گئی تو صبح کے ملگجے اُجالے نے اس کے ہاتھوں میں دس دس کے کئی نوٹ دے دیئے۔

وہ پاگل بھی نہیں ہوئی، اس نے حواس بھی نہیں کھوئے، اُسے البتہ اس بات پر پورا یقین آ گیا کہ شبیر بھائی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کے ہاتھ کی لکیریں بتاتی ہیں کہ وہ بہت پیسہ کمانے والی ہے۔

دونوں ہاتھوں میں ڈھیر سارے نوٹ اُٹھائے جب وہ پہنچی براق کے بدنام محلّے والے ایک چھوٹے سے مکان میں اپنے باپ کے سامنے پہنچی تو پہلے تو باپ کو سوجھا ہی نہیں کہ وہ کیا کہے۔ پھر جب وہ روپے باپ کے سامنے ڈال کر کمرے میں واپس چلی گئی تو دو دن کے بھوکے پیٹ نے خوش ہو کر پروردگار کے سامنے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

"شکر ہے میرے مالک کہ میری بیٹی کو ایک ٹھکانا مل گیا ـــ"

پانچواں مینار

افوہ ! پوری حرافہ تھی کمبخت !

جہاں جاتی وہاں آگ لگا دیتی ۔ لینا ایک نہ دینا دو ــــ مگر ہر کسی کے پھٹے میں پاؤں اڑا نے کی عادت ایسی پکی پڑ گئی تھی کہ پوچھئے نہیں۔ طرّاری کا وہ عالم تھا کہ ابھی یہاں تھی اور ابھی اچھال چھکا بنی وہاں۔ ساری ڈیوڑھی کو گھما کر رکھ ڈالا تھا۔ نہ شرم نہ حیا ۔ کبھی باپ کے کمرے سے نکل رہی ہے ۔ کبھی بیٹے کے ــــ بڑے مزے سے کہتی ــ "میرے کو کیا جی ــ باپ ہو کی بیٹا ــ اپن تو بس ــ دیوال ہیں دیوال ۔ بس دینے سے کام ہے، مانگنے والا کوئی بھی ہو، میری جوتی سے کی رشتے نلطے آنکتی بیٹھوں ــ"

شیشے کا سا بدن تھا، جیسے گلابی رنگ بھرا ہوا تھا۔ ماں نے شاید اسی مناسبت سے نام ہی گلابی رکھ دیا تھا کہ بے بھاؤ گلابیاں چھلکاتی پھرتی ــ

سارا شوق بس کپڑوں کا تھا ۔ ہرے، نیلے، پیلے، کالے، اودے، قرمزی، شہابی، انگوری ــــ بس رنگا رنگ کپڑے ہوں ــ چاہے کسی بھی ذریعہ سے ملیں ــ کوئی ہتھیلی پہ پیسے دھرتا تو بدک اٹھتی ۔

"میرے کو یہ روپے، اٹھنیاں، نکو پکڑاؤ ــ امّی لے لیں گی، اس کے بدلے میں ایک اوڑھنی لا دیو ــ"

پاجاموں کرتوں، اوڑھنیوں، غراروں، شلواروں کا ایک ڈھیر لگا رکھا

تھا، ڈیوڑھی کی بیگمات میں ساڑھی بھی نئی نئی مقبول ہو رہی تھی۔ نیا پہناوا تھا بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس کے پاس ساڑیاں بھی اتنی ڈھیر سی جمع ہو گئی تھیں کہ اس کی حیثیت والیاں دیکھ کر دانتوں میں انگلی دبا لیتیں۔

ڈیوڑھی والے کہتے "گلبی" (یہ اس کے نام کی بگڑی ہوئی شکل تھی) کے کاٹے کو پانی مانگنے کی بھی سدھ نہیں رہتی ــــ ایسا ڈستی کہ ساری جان آنکھوں میں آ اٹکتی ــــ آنکھیں جو بس اسے دیکھتے ہی رہنا چاہتیں ــــ برساتوں میں گھن گھن پانی برستا اور سب لوگ چھپ چھپا کر کمروں، دالانوں میں بیٹھے ہوتے تو وہ جان جان کر ایک سے ایک باریک کپڑے پہن کر بھیگی بھیگی پھرتی ــــ اور جسم جب دوسروں کو دعوتِ گناہ دیتا تو ذرا سے اشارے پر کسی نہ کسی کمرے میں گھس جاتی۔ کوئی ساتھ والی پوچھتی "کہاں گئی تھی گے کتی ــــ ؟

وہ بڑی لاپروائی سے بولتی " ذرا میاں کو"ناشتہ" کرا رہی تھی ۔" چوما چاٹی کو وہ ناشتہ بولتی اور جو معاملہ اس سے آگے بڑھتا تو بڑی ڈھٹائی سے اور بے شرمی سے کہتی ۔" کھانا کھلانے کو آرئی ہوں ۔"

بقول اسی کے" میں جدھر نکل گئی ادھر سمجھو طوفان مچ گیا۔"

ایسے میں نزاکت جہاں کو اپنے عاشق کا امتحان لینے کے لئے گلبی سے اچھا ممتحن نہ مل سکا۔

محبت کے کھیل بھی نرالے ہیں! بھئی واہ ــــ کوئی سُنے تو کیا سوچے کہ اتنے بڑے نواب نفیس الدولہ کی اکلوتی بیٹی اور محبت بھی ہوئی تو کس سے ؟ اپنے باپ کی ڈیوڑھی کے ایک حقیر سے پالکڑے پروردہ احسن سے!

بڑی نوابن نے مدتوں پیچھے ایک چھوکری پالی تھی جس کی شادی ڈیوڑھی ہی کے ایک ملازم سے کردی تھی ۔ سال پیچھے ایک لڑکے کو جنم دیتے ہوئے وہ چھوکری اللہ کو پیاری ہوگئی ۔ بڑی نوابن (کر ساری ڈیوڑھی کے نوکروں، مالکوں کی بی بی ماں تھیں) اس یسیر چھوکرے کی بھی اماں ہی ٹھہریں۔ ملازم کی شادی کسی اور چھوکری سے کرکے اسے صاف جتادیا،

"میاں تم یہ سمجھ لیو کی تم کنوارے تھے اور اب تمہاری شادی ہو گئی یہ بچہ میں نے لے لی ۔ تم بے شک اس کو پیار کرنا، مگر یہ مت سمجھنا کی اپنے تمہارا کوئی ہے ، کیوں کی میرے کو معلوم ہے کی سوتیلے ماداں کتی بھی محبت کرے تو وہ جھوٹی اچ ہوتی ۔"

احسن بڑا ہوا تو بی بی ماں نے اُسے ایسے پیار سے جیسے اپنا ہی پوتا ہو، مولوی صاحب کے ساتھ بٹھایا ۔ چار برس، چار مہینے، چار ہفتے چار دن کی ننھی سی جان کو جب بسم اللہ پڑھائی گئی تو پوری ڈیوڑھی میں بھی اسی طرح جشن ہوا جیسے کسی مالک کے بچے کی بسم اللہ پر ہوتا ہے۔

بی بی ماں نے احسن کو گود میں بٹھا کر پیار سے پوچھا، "بابا آج تمہاری بسم اللہ ہے ۔ تمے چار برس، چار مہینے، چار ہفتے، چار دنیاں پورے کرلئے ۔ آج تم کیا منگتے ؟ "۔ اور انھوں نے سامنے پھیلے ہوئے مٹھائی کھلول اور دیگر لوازم کے ٹوکروں کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن احسن جو اس وقت، مہربان رانی کی گود میں بیٹھا روایتی شہزادہ بنا ہوا تھا ۔ اس مانگ پر کہ مانگ کیا مانگتا ہے؟ ایسی ویسی چیز مانگنے والا نہ تھا ۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی ذہین اور بے چین نگاہیں ادھر

اُدھر گھمایئں، اور بی بی ماں کی بڑی بہو یعنی نواب نفیس الدولہ کی بیگم کی گود میں بیٹھی ننھی ننھی سی گڑیا کی طرف اشارہ کیا اور انتہائی بے تکلفی سے بولا

" میں تو یہ گُڈیا لیوں دا ۔"

نزاکت جہاں اس وقت دو ماہ کی بھی نہیں ہوئی تھیں، ابھی ابھی تو بڑی بہو بیگم چھلّہ نہا کر اٹھیں تھیں ۔ احسن کی اس مانگ کے ساتھ ہی یہاں سے وہاں تک ساروں کو سانپ سونگھ گیا ۔ بڑی دیر کے سنّاٹے کے بعد بی بی ماں بات بنھانے کو ہنس کر بولیں ۔

" اگے پگلے چھوکرے لوگاں گڑیا نہیں کھیلتے ۔"

لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ اس چھوکرے نے گڑیا ہی پسند کی تھی اور یہ پسند ایسی تھی بھی نہیں کہ یوں پسند کیا یوں بھلا بیٹھے یہ وہی پسند تھی جو آگے چل کر صحراؤں کی خاک چھنوا دیتی ہے ۔ جو پتھروں کو کاٹ کر نہریں نکلوا دیتی ہے ۔

بی بی ماں نے اپنے جیتے جی جو عہد اپنے خدا سے کیا تھا وہ پورا کر دکھایا اسلامی تعلیم پوری ہونے کے بعد انھوں نے احسن کو حیدرآباد دکن کے ایک سے ایک اعلیٰ اسکولوں میں پڑھوایا ، بڑے نواب صاحب' جن کو تعلیم کا شوق جنون کی حد تک تھا، خاندان کے سارے غریب اور نادار رشتہ دار لڑکوں کی تعلیم کا بار اٹھائے ہوئے تھے ۔ ڈیوڑھی کے باہر مردانے میں گویا ایک ہوسٹل کھول رکھا تھا ۔ کھانے پینے، کپڑے، لتے کے اخراجات سے لے کر ہر ہر چیز انھوں نے اپنے ذمے لے رکھی تھی ۔ ہر سال لڑکوں کی کھیپ کی کھیپ پڑھ کر نکلتی ۔ لیکن ڈیوڑھی کی تاریخ میں یہ پہلا

واقعہ تھا کہ کسی یا لڑکی چھوکری کے بیٹے نے کالج کا مونہہ دیکھا ہو اور نہ صرف مونہہ دیکھا ہو بلکہ بی اے کی ڈگری بھی حاصل کرلی ہو۔

اور یہ ٹھیک انہی دنوں کی بات ہے جب نواب نفیس الدولہ کی اکلوتی بیٹی نزاکت جہاں کے حسن جہاں تاب کا سورج عین نصف النہار پر جگمگا رہا تھا ۔۔ اور دن کو یہ بات یاد رہی ہو نو رہی ہو کہ چار سال کے ایک ننھے سے بچّے نے کیا چیز اپنی منہ بولی دادی سے مانگی تھی۔ لیکن خود بچّہ یہ بات بالکل نہیں جانتا تھا۔ ویسے بھی اس نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں قدم قدم پر امارت کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ کالج میں جو لڑکا اپنے ساتھیوں میں اس قدر بے باک، کھلنڈرا اور ذہین مشہور تھا، وہ حویلی کی چاردیواری میں قدم رکھتے ہی چوہا بن جاتا۔ اس نے غریبی امیری کے فرق کو ہوش سنبھالتے ہی جان لیا تھا، لیکن اس بدنصیبی کا کیا علاج تھا کہ ایک دن رمضان شریف کے تیسویں روزے کو، عید کا چاند دیکھنے ڈیوڑھی ہی کے سارے لڑکے بالے، اور لڑکیاں، چھوکریاں، چاندنی پر چڑھے ہوئے تھے کہ اچانک اسکو زمین پر ہی چاند نظر آگیا۔۔ پہلی کا باریک، نوکیلا چاند نہیں، چودھویں کا جھم جھماتا چاند ۔۔ وہ چاند جو بیک وقت اس کے دل کو ایک ساتھ روشن اور تاریک کرگیا۔

بڑے نواب اور بی بی ماں مدّت ہوئی ختم ہو چکے تھے۔ اب اس ڈیوڑھی کا سارا کاروبار نواب نفیس الدّولہ اور ان کی بیگم کے ہاتھ میں تھا بڑے نواب میں پھر بھی یہ خوبی تھی کہ وہ انسان کو انسان سمجھتے تھے۔ لیکن نفیس الدّولہ تو تلوار کی دھار تھے۔ اپنی آن بان اور اونچی ناک کے سوا،

انھیں کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ بڑے نواب کی زندگی میں ان کے بنائے ہوئے ہوسٹل کے غریب رشتہ داروں کے لڑکوں کا زنان خانے میں کسی کام سے چلے آنا معیوب نہ تھا، لیکن نواب نفیس الدولہ نے یہ حکم لگا دیا تھا کہ " بلا اجازت کوئی زنانے میں پاؤں بھی نہ دھرے۔ پہلے ہمارے سے آکو پوچھو پھر اندر جاؤ۔"

ایسے میں کسی کے زنان خانے کے اندر بھٹکنے کی بات سوچی تک نہیں جاسکتی تھی۔ لیکن جہاں چاہ ہو وہاں راہ تو نکل ہی آتی ہے۔

نزاکت جہاں انٹر میں بیٹھنے والی تھیں۔ انگلش تو فرفر بولتی تھیں۔ گاڑی آکر اٹکی تھی حساب میں۔ حساب سے ان کی جان جاتی تھی۔ پپا تک بات پہنچی۔ انھوں نے حیرت سے کہا:

" حد ہوگئی۔ ڈیوڑھی میں اتے سارے چھوکرے ہیں۔ اردو، انگلش تیلگو، ہسٹری، جغرافیہ، حساب، جیومیٹری، الجبرا جتے چاہو اُتے ماسٹراں، تم بی بی کائے کو اپنا جی خراب کرتے، کل سے احسن تم کو پڑھا دیا کرے گا۔

اب کوئی یہ سوچے کہ حساب کے درس کے ساتھ ساتھ احسن نے عشق کا درس بھی دینا شروع کردیا۔ تو یہ سوچنے والے کی اندھی عقل کا قصور، وہ تو بیچارہ ایسا موم کی ناک کہ دو اور دو چار کا حساب بھی نزاکت جہاں کے سامنے بھول جاتا۔ نیچے سر کرکے جو بیٹھتا تو آنکھ اوپر نہ ہوتی، کتنی غلطیاں تو خود نزاکت جہاں نکال دیتی۔ جواب بھی نیچا سر کئے ہی دیتا۔ اور غالباً نواب صاحب کی سوچی سمجھی اسکیم ہی تھی جو احسن کو مقرر کیا کہ گھر کا نوکر آدمی ہے، عزت کا خیال کرکے ہی پڑھائے گا۔

اور نزاکت جہاں کو ان نیچی نگاہوں کی مار ہی تو لے ڈوبی۔ دیڈی

میں دیدے ڈال کر، ہاتھوں، پیروں کو چھو چھوا کر اگر وہ کوئی الٹی پلٹی حرکت کرتا تو شائد وہ بھی اس کے پیچ خون کی قائل ہو جاتیں مگر اس نے تو کبھی بھول کر بھی اس کے چہرے پر نگاہ نہ ڈالی جو سیاہ راتوں میں اس کے مقدر کی روشنی بن کر جم جماتا تھا۔

جب امتحان کو چند دن رہ گئے تو اچانک نزاکت جہاں کو احساس ہوا کہ وہ مرجائیں گی۔ بن موت مرجائیں گی۔ احسن کا پڑھانا ختم ہو جائے گا اور زندگی سے ان کا ناطہ بھی ختم ہو جائے گا۔ یہ عجیب بات تھی کہ پڑھائی کے دوران، کبھی دونوں میں پڑھائی سے ہٹ کر کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن اس دن نزاکت جہاں نے پوچھ ہی ڈالا "احسن تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟ بی اے تو تم کر ہی ڈالے۔"

وہ ہنسا۔ "ارادہ؟ میرے خیال سے میں نوکری کر لوں گا۔"

"نوکری؟" وہ حیرت سے بولی۔ "اس ڈیوڑھی میں آج تک کوئی نوکری کرا۔؟"

احسن نے دکھ سے بھاری آواز میں کہا: "آپ کا شکریہ بی بی پاشا کہ آپ مجھے ڈیوڑھی والوں میں سے ایک سمجھتے۔ مگر میں آپ کو یاد دلادیوں کہ میں ڈیوڑھی والا نہیں — ڈیوڑھی ہی کا ایک حقیر نوکر ہوں۔"

نزاکت جہاں کچھ نہ بولی۔ تھوڑی دیر سوچ کر وہ مسکرائی۔ "ٹھیک ہے۔ میں بپا سے بولونگی کی وہ آپ کو ایسا کوئی کام دے دیں کہ آپ کو باہر جانے کی کھٹ کھٹ نہ ہو۔ اپنے مختارِ عام بہوت بڈھے ہو گئے ہیں۔ کبھی آپ ان کا ہاتھ بٹائے، محل کے حساباں سنبھالے

تو آپ چھوٹے مختارِ عام ہو جائیں گے۔ تنخواہ سو سے تو اوپر آٹھ ملیں گی۔"

احسن نے بڑی احسان مند نگاہوں سے اُسے دیکھا اور جسم جنم کی ہمتیں سمیٹ کر بولا ۔ " آپ کے شکریے کے واسطے میرے پاس لفظاں نہیں مگر اب میں حیدرآباد میں رہنا نہیں چاہتا۔"

"کیوں ؟" نزاکت کی آواز میں حیرت اُمڈ پڑی

" اس واسطے کہ یہ شہر میرے کو کوئی خوشی نہیں دے سکیں گا ۔ بی بی پاشا، میں جو چاہوں گا میرے کو ملنے سے تو رہا، پھر اپنا دل آپ جلا کے کوئی فائدہ نہیں۔"

" مگر تم چاہتے کیا احسن ؟ " نزاکت جہاں نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر حیرت سے پوچھا۔

" وہ جو زندگی بھر سر جھکاتا ہوا تھا، آج جانے کہاں سے اتنی ہمت سمیٹ لایا ۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بولا۔

" بی بی پاشا، میں آپ کو چاہتا ہوں ۔"

اور وہ اس کے حواسوں پر بجلی گراتا، یوں کمرے سے نکل گیا کہ وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی ۔

گلبی اور نزاکت جہاں ساتھ ساتھ کھیلی، پلی بڑھی تھیں۔ سماجی رتبے اور درجے کے فرق کے ہوتے ہوئے بھی دونوں میں ایسی پکی دوستی تھی کہ کوئی پوچھے نہیں۔ گلبی کے معاشقوں کی ایک ایک داستان نزاکت جہاں کو معلوم تھی ۔ اس کا حرافہ پن، اس کا کپڑوں کا شوق، اس

آوارگی، اس کی ساری کمزوریاں، بی بی پاشا کو معلوم تھیں اس کے باوجود دوستی کا دھاگا اتنا مضبوط تھا کہ بہو بیگم لاکھ بی بی پاشا کو ڈانٹیں کہ۔
"ایسے چھینالوں میں اتنا اٹھنا بیٹھنا ٹھیک نہیں بی بی جی ۔۔ مگر تم سنتے اچ نہیں ۔ بیر بہوٹی کو ڈبّی میں رکھ کو چاول کے سفید دانے ڈال دیو تو اُنے بیر بہوٹی اپنا رنگ دے دیتی ۔ تم کاٹے کو اس کے رنگ میں رنگتے ۔"
مگر نزاکت جہاں کا اپنا رنگ تھا، کوئی اور رنگ ان پر کیا اثر کرتا ۔
اوہر گلبی کی امّی آ سے مرے نک مارتی، ایک سے ایک ننگی گالی دیتی، مگر وہ تو لوٹ پوٹ کر یوں ہی ہنستی ہوئی اُٹھ جاتی ۔
" اگے حرام کی پوٹ تیرے کو کوئی بیاہ کو نئیں لے جائیں گا ۔ ماں بڑبڑاتی "کس کے باپ کی مجال ہے کی میرے کو بیاہ کے لے جائے ۔ وہ وکیل گواہی ہور مرضی لینے کو آتا، کیتے نا ؟ گھونگھٹ اٹھا کو اسکلاچ بولنا چوم لیوں گی کی میرے کو تو تیرے سنگات اچ شادی کرنا ہے ۔" بیٹی جواب دیتی ۔ اسے بھلا کوئی کیا کہتا ۔ ؟
اس رات بی بی پاشا نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو بڑی بڑی ہمّت والی بیبیاں بھی نہیں کرتیں ۔
"اگر احسن محبت میں سچّا ہے تو میں بھی اسی سے اچ شادی کر لیوں گا ۔"
"لیکن محبت میں پرکھا کیسے جائے کہ شیدائی سچا ہے ۔ ؟"
"گلبی ۔ آجکل کس کس سے تیرا عشق چل رہا ہے ۔ ؟" انھوں نے بلا کر اس سے بڑے پیار سے پوچھا ۔

"اب کیا بتاؤں پاشا ۔ یہاں سے لے کو وہاں تک ایک سرے سے سبھی اچ اوندھے پڑے ہیں ۔

"سچّی ؟" وہ مسکرائی

پھر کیا ؟ پرسوں دربان کو"ناشتہ"کرا کے آئی، پھر اس کے چھوکرے کو باقاعدہ"کھانا"کھلادی ۔ جو بڑا انگلش بگھارتا پھرتا ہے نا!"

"چھی چھی گلبی ۔ تو بڑی بدمعاش ہوگئی ہے ۔"

"اب پاشا، یہ تو چلتا اچ رہتا ہے ۔ کپڑے دیکھو نا پاشا، کتّے ڈھیر سارے جمع کرلی ہیں ۔"

"ٹھیک ہے کرلی سو ۔ یہ تو بتا وہ بڑا پڑھنتر چھوکرا ہے نا احسن ۔ اس کو اوندھا کری کیا نئیں اب تک ۔ ؟"

وہ تن کر بیٹھ گئی ۔ "اگے پاشا ۔ یہ اپنے مردوں کا کیا ٹھیک ہے، ذرا ہنس کر دیکھ لیو ۔ ختم!" اس نے بڑے اسٹائل سے گردن پر آڑا ہاتھ پھیرا ۔ اور ذرا انگلی پکڑلیو تو اُنوں پورا پہونچا پکڑنے تیار ۔"

"ارے نئیں گلبی ۔ بعضے بعضے مرداں شرم وحیا پو جان دیتے تو سب کو ایک جیسا سمجھ رئی ۔"

"اگے جان دیو نا پاشا، شرم ورم کچھ نئیں ۔ بس عورت ہونا مردوں کو۔"

"اچھا یہ بات ہے تو احسن کو پرچا کے بتا ۔ تب مانوں گا ۔ ہاں ۔"

اس نے کھٹ سے چٹکی بجائی ۔ "اگے پاشا آج سے تیسرے دن ایک ساڑی آپ کو لا کو نہ بتائی تو نام بلٹا دینا ۔ احسن میاں کا دیا ہوا تحفہ"

اس شام بادل ایسے چھم چھم برسے کہ ساری ڈیوڑھی دھرتی کی سوندھی سوندھی خوجان لیوا خوشبو سے بھر گئی۔ سَن سَن چلتی ہواؤں نے جانے کتنوں کو بہکایا۔ سیکڑوں قسم کے پھولوں سے ملکر ایک ایسی خوشبو وجود میں آئی جو اچھے اچھوں کے ایمان ڈگمگا دے۔ ماحول ایسا کافر۔ اور اس پر گلبی نے نزاکت جہاں کے سنگھار دان سے گاڑھے گاڑھے اصلی شمامۃ العنبر کی پوری کی پوری شیشی اپنے شیشے ایسے بدن پر انڈیل ڈالی۔ مٹھائی جن گلابی کاغذوں میں بندھ کر آتی تھی ان میں سے ایک کاغذ کو ذرا گیلا کرکے اس نے اپنے ہونٹوں کو شفاف یاقوتوں کا رنگ عطا کیا۔ آنکھوں میں کاجل اتنی دور دور تک اندر باہر ڈالا کہ کانوں کی لوؤں تک آنکھیں لمبی دھاردار کٹار بن گئیں۔ گھنے گھنیرے بالوں کو یوں ہی پیٹھ پر چھوڑ دیا۔ کرتا اتنے بڑے گلے کا پہنا کہ ذرا جھکے اور ایمان والوں کا ایمان ختم۔۔!۔

شام پڑے سے پھر بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔

"یا شا۔" وہ طراری سے اچھلتی کودتی نزاکت جہاں کے کمرے میں آئی۔ آج بھوک کا صفایا سمجھو۔ احسن میاں کو ایک ساتھ ناشتہ بھی اور کھانا بھی۔۔۔۔"

نزاکت جہاں نے اُسے دیکھا اور تھرا سی گئیں۔ کون نصیبے والا اُس موت سے بچ سکتا تھا۔؟ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ مرد شرمیلی عورت پر زیادہ ریجھتا ہے۔ صاف سچی بات تو یہ ہے کہ عورت شرمیلی ہوتی ہی نہیں اشاروں سے، کنایوں سے ہمیشہ پہل وہ کمبخت ہی کرتی ہے۔ ساری، مذہبی کتابیں اٹھا کر دیکھ لو۔ بیچارے آدم کو بہکایا کس نے؟۔

صبح کو بڑا خوشگوار موسم تھا۔ دُھلا دھلایا ماحول باغ میں سے نکھری نکھری خوشبوئیں آکر دل کو سرے سے جینے پر آمادہ کر رہی تھیں۔ ناشتہ نزاکت جہاں کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ابھی پراٹھے کا ایک لقمہ توڑا ہی تھا کہ گلبی اندر داخل ہوئی۔

نزاکت جہاں نے دھڑکتے ہوئے دل سے اسے دیکھا۔ بجید جھلائی ہوئی تھی۔ ایک عورت ہاری ہوئی عورت!

"کیا ہوا ؟" نزاکت جہاں نے بے پروائی سے پوچھا

ہوتا کیا ؟ میں فانوس روشن کرنے کے بہانے پہنچی ۔ ہور جان بوجھ کر خریب سے گزری کی، خوشبواں انوں کا دل ایسا ویسا کردیں۔ پن وہ تو ویسے ہی بیٹھے کچھ پڑھتے رہے، پھر میں تو سیدھا انوں کی گودی میں جاگری تو ہلو سے میرے کو اٹھا کو کھڑا کرڈیئے۔ ہور بولے

" فانوس کائے کو روشن کرتی ہے، گلابی ؟ میرا دل جو جل رہا ہے کیا اس کی روشنی اندھیرا دور کرنے کو کافی نہیں۔"

پاشا اِدھر ٹھنڈی ٹھنڈی، بھیگی بھیگی پھوار تھی اور ادھر میرا بھٹی کے جیسا تپتا بدن ۔ کوئی جیسا مرد ہوتا تو میرے کو پھاڑ کھاتا ۔ پن وہ ویسے ہی ٹھونٹھ بنے بیٹھے رہے۔ میں تو جانوں نامرد ہیں انوں ۔"

گلابی کی یہ گالی بھی نزاکت جہاں کے دل پر پھول بن کر گری ۔ پھر یہ ہوا کہ گلابی نے اسے گویا اپنے وقار کا سوال بنا لیا کہ احسن کو زیر کرے۔ اپنی پاشا کے احساسات سے بے خبر وہ عورت پن کے سارے حربے آزما آزما کر تھک گئی، لیکن وہ پہاڑ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔

گلابی کی ہار نزاکت جہاں کی جیت بن گئی۔ ایک رات کو نزاکت جہاں نے اپنے دل کے سارے درد کو سمو کر پپّا کو خط لکھا۔

میرے پپّا :-

میرے کو معلوم ہے کی آپ اپنے اصولوں کے کتّے پکّے ہیں۔ آپ کی مرضی کے خلاف اس ڈیوڑھی میں ایک پتّہ بھی نہیں ہل سکتا۔ پھر بھلا میں ایسا اتّا بڑا کام آپ کی مرضی کے بغیر سوچوں بھی کیسے۔ ؟

پپّا میں یہ خط آپ کو لکھتے ہوئے کچھ عجیب سا محسوس کر رہا ہوں، میرے کو معلوم ہے کہ یہ خط آپ کو غصّہ بھی کر سکتا ہے، مگر پپّا آپ زندگی بھر سے میرے کو اتّا پیار دیئے کہ میں اتنی ہمت کر سکا ہوں کہ آپ سے دل کی بات خلم کے ذریعہ کر سکوں، کیوں کہ میرا کوئی رازدار سہیلی یا بہن نہیں کہ میں اپنا پیغام آپ تک پہنچوا سکوں، تما سے میں اتّا فری نہیں۔ پھر دل کی بات کس سے بولوں۔ ؟

پپّا میرے کو معلوم ہے کی اب اکزام کے بعد میری شادی طے ہونے والی ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر پیغام موجود ہیں ان میں کوئی بھی لکھ پتی سے کم نہیں۔ سارے ہی ایسے ہیں کی میرے کو چاہیں تو زیور میں سونے میں تول سکتے ہیں۔ مگر پپّا میں آپ سے ایک بات بولوں۔ کیا دل کی خوشی زیور اور

روپے پیسے سے مل سکتی ہے۔؟ میری سمجھ میں نہیں آتا
کہ میں وہ ہمّت کہاں سے پالیا جو آپ کو یہ سب سنا
رہا ہوں۔ شاید پپّا وہ محبّت جو بچپن سے آپ میرے
کو دیئے میری ہمّت کی زبان بن گئی ہے۔ میرے کو یاد ہے
پپّا، نوکروں کی ایک فوج کی فوج محل میں ہونے کے باوجود بچپن
میں کبھی میں روتا تھا تو آپ کندھے سے لگا کر گھنٹوں
ٹہلا کرتے تھے۔ پپّا اسی محبت کا واسطہ میرے کو میرے
دل کی خوشی دے دیجئے۔ میں نے آج تک آپ سے کوئی
چیز نہیں مانگا پپّا۔ آج ایک چیز کے واسطے ہاتھ آپ کے
سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہوں۔ مجھے خود احساس ہے کہ یہ
سب سُن کر آپ کے دل کی کیا حالت ہو جائیں گی —
مگر پپّا محبّت کا یہ تناور درخت ایک دو پل میں نہیں،
برسوں گزرنے پر اپنی جڑ مضبوط کرا ہے۔ اسی مارے
میں یہ ہمّت سمیٹ سکا۔ آپ کو اگر میرے سوال کا جواب
"نہ" میں دینا ہے تو میرے سنگھاردان پر کل رات ایک
موم بتی جلا کر رکھ دیجئے۔ ہاں کی صورت میں آپ کی طرف
سے کوئی اشارہ نہیں چاہیئے۔

مجھے احسن سے بیاہ دیجئے، پپّا۔ میرے کو معلوم ہے
کہ یہ سوال آپ کو اتنا غصّہ دلا دے گا کہ آپ مجھے جان
سے مار دینے پر بھی تل سکتے ہیں مگر پپّا آپ اپنا اکلوتی

بیٹی کی خوشی نہیں چاہیئے کیا۔؟

آپ کی پیاری بیٹی

نزاکت جہاں

دوسرے دن نزاکت جہاں نے اپنی سنگھار میز کو بڑے چاؤ سے جاکر دیکھا تو وہاں ایک بہت بڑی مشعل جل رہی تھی۔ بڑی ساری مشعل اس بات کا ثبوت تھی کہ پپا بےحد غصّہ میں ہیں۔ ورنہ نزاکت جہاں کے کہنے کے مطابق وہ موم بتی بھی تو جلا سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے بے پناہ غصّے کا اظہار یہ آگ جلاکر کیا تھا۔

نزاکت جہاں آخر کو بیچاری لڑکی ہی تھی۔ بُری طرح ڈر گئی۔ دو تین دن تو وہ مارے ڈر کے اپنے کمرے سے نکلی ہی نہیں۔ پھر ڈر دب گیا اور اس پر بغاوت کا جذبہ غالب آگیا۔ اس نے گلابی کو بلوا بھیجا۔ گلبی کے گلے لگ کر وہ اچانک رو پڑی۔

"گلبی ۔ میں احسن کے بغیر مر جاؤں گا۔"

گلبی سناٹے میں آگئی۔ بڑی دیر بعد وہ سنبھلی

"پاشا، اب میں سمجھی۔ آپ اُنوں کو آزمارئے تھے۔ سچّی بولتی پاشا، غریب کے بیٹے ہیں تو کیا ہوا۔ اُنوں آپ کے اچ لائق ہیں۔"

"مگر پپا۔ پپا نہیں مانتے نا گلبی۔"

"تو بھاگ جائیے۔" گلبی نے دوٹوک رائے دی۔

"بھاگ جاؤں؟" نزاکت جہاں مارے خوف اور حیرت کے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "اِتّی بڑی حویلی سے نکل کے کر بھاگ جاؤں۔"

ساری دنیا کو اپنے پیار پر ہنسنے کے واسطے چھوڑ کو بھاگ جاؤں ۔؟ نکو نکو گلابی نکو ۔۔۔ میرے کو ایسے اُلٹے پلٹے مشورے نکو دے ۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔۔ " اللہ گلابی ہیں ویسے لڑکیوں میں سے نہیں ہوں ۔ جو کھلم کھلا اپنے رشتہ دار چھوکر دن، منگیتروں سے چھیڑ چھاڑ دھینگا مستی کرتے ۔ میں تو اپنے دل میں اُنوں کی محبت کا چراغ جلالے کو بیٹھا۔ کسی کو معلوم بھی نہیں کہ یہ محبت کتنی پرانی ہوگئی ۔ میرے کو تو ایسا لگتا کہ میں ساری زندگی بھر سے ایک اُنوں کی آس میں اچ ہوں ۔۔ اُنوں کی خاطرچ رہا ہوں ۔۔ "

گلابی کو اور کچھ نہ سوجھا، وہ دوڑی گئی، احسن کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی پچھلے دروازے میں سے لے آئی اور نزاکت جہاں کے سامنے ڈھکیل کر بولی ۔ " میری پاشا کو سمجھاؤ ذرا ۔ مرد ہوئیں گے تو ہمت بتاکو لے بھاگیں گے ۔ نئیں تو..... اور وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر باہر چل دی ۔

پاگل نہ بنئے بی بی پاشا ۔ میں آجکل سے نہیں مدتوں سے یہ بات سمجھ رہا تھا کہ آپ کے دل میں کیا ہے ۔ کیونکہ خود میرے دل میں بھی وہی کچھ تھا لیکن میں ایسے راستے پر قدم اٹھانا ہی نہیں چاہتا تھا جو منزل پر پہنچانے کے بجائے منزل سے اور دور کر دے ۔

" تو مجھے بھگا کو لے چلو احسن ۔ میرے کو یہ حویلی حفس معلوم ہوتی ہے "

" بھگا کے ۔؟ آپ کو ؟ ۔ بی بی پاشا، آپ پاگل ہو رہے ہیں ذرا دوبارہ سوچئے ۔ آپ کیا بد زبان مونہہ سے نکالے ہیں ۔ میں ایسا سوچ نہیں سکتا ۔ "

" میں ذات پات، امیری غریبی کو ٹھوکر مارتا ہوں - میں - میں"
جذبات کی شدت کے مارے اس کا دم گھٹا جا رہا تھا - " میں صرف تم
کو چاہتا ہوں احسن - تم کہ - تم کہ خدا کا واسطہ میرے کو بھگا کے لے
چلو - "

" ہلو سے بولیئے، بی بی پاشا - بازو ہی میں نواب صاحب کا کمرہ ہے
اگر انوں سن لئے تو - "

اور اچانک ڈرامائی انداز سے دروازہ کھول کر نواب نفیس الدولہ
کمرے میں داخل ہوئے اور چلا کر بولے - " ہاں، ہاں ہم سن رہے ہیں -
سب کچھ سن رہے ہیں کی ہمارے جیتے جی اس محل میں کیا کیا ہو رہا ہے - "
شاہی دبدبے اور جلال سے ان کا سراپا کانپ رہا تھا - "

" " نزاکت جہاں - " وہ انگلی اٹھا کر بولے - " آج سے ٹھیک
آٹھویں دن تمہاری شادی کر دی جایئں گی - اور احسن میاں تم - تم کیونکی
ابا حضور کے دلارے تھے بول کے ہم تم کو خالی چھوڑ رہے - نئیں تو
آج تمہاری گردن اڑا دیتے - تم دونوں خبیثوں نے محبت کرنے سے
پہلے یہ تو سوچا ہوتا کہ حیدرآباد دکن کی نوابی محفلوں کی ہم جان ہیں
ہماری جو عزت اور رتبہ ہے وہ تاریخ گواہ ہے کسی کسی نصیبے والا کو ہی
مل سکا ہے، ہم تم جیسے پالکرٹے، نکٹے اور دو ٹکے کے آدمی کو اپنی بیٹی
بیاہ سکتے تھے، یہ خود تمہارے سوچنے کی بات تھی - ! ٹھور ٹھکانا -
ڈھونڈنے کے واسطے تم نا ہم تین دن کی مہلت دیتے ہیں - چوتھے دن
تمہاری صورت یہاں نہیں دکھنا - سمجھے - ؟

چوتھے دن احسن نے ہمیشہ کے لئے ڈیوڑھی چھوڑ دی ۔ لیکن اکیلے نہیں ؟ نزاکت جہاں کے ساتھ ۔

" نواب صاحب کی بیٹی بھاگ گئی ! "

" نواب صاحب کی بیٹی بھاگ گئی ! "

" نواب صاحب کی بیٹی اپنے نوکر کے ساتھ بھاگ گئی ! "

ہر زبان یہ کہنا چاہتی تھی ، لیکن نواب صاحب کا دبدبہ کسی کو زبان نہیں کھولنے دیتا تھا ۔

جان پہچان والوں میں کسی نہ کسی طور پر یہ خبر اڑ ہی گئی ۔ یوں جیسے پرسہ دینے والے آتے ہیں ۔۔ لوگ آتے ، لیکن نواب صاحب کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی ۔ وہ چہرہ جو زندگی بھر دبدبے اور رعب سے سورج کی طرح جھم جھما رہا تھا ، آج گہنا گیا تھا ۔

ڈاکٹروں کے مشورے پر نواب نفیس الدولہ اپنی بیگم اور چند ملازموں کے ساتھ آب و ہوا تبدیل کرنے کی غرض سے پہاڑ پر آئے ہوئے تھے ۔ جوان بیٹی جو کلنک ماتھے پر تھوپ گئی تھیں بیگم صاحبہ بھی اس کے صدمے سے نڈھال تھیں ۔ لیکن نواب صاحب کے غم نے ان کے اپنے غم کو ڈھانپ لیا تھا ۔

اس دن نواب صاحب کی طبیعت ذرا بحال دیکھی ، تو بیگم صاحبہ ٹھنڈا سانس بھر کر بولیں ۔۔ " خدا بدلہ لینگا ۔ ایسے محبت والے ماں ، باپ کا دل توڑ کو گئی ۔۔ ایسی خاندان کی عزت ، کو چونا لگا کو گئی ۔ خدا ترسا ترسا

کرمارینگا ــــ"

"مت کوسو بیگم ــــ مت کوسو" نواب صاحب غم اور دکھ سے بوجھل لہجے میں بولے ــــ"

" کیسے مت کوسوں، وہ بھی حرام زادی، ہوراس کا سنگا، دونوں کے تن تن میں کیڑے پڑیں گے .

نواب صاحب نے لپک کر بیگم کا موہنہ بند کردیا

" وہ دونوں بڑے معصوم، بڑے پیارے بچے تھے،، بیگم آپ کو کچھ نیئں معلوم ــــ"

" آپ کا سر زندگی بھر کے واسطے جھکا کو رکھ دیئے، ہور پھر بھی بڑے پیارے، معصوم بچے تھے . ؟

"ہاں بیگم ــــ بہوت معصوم، بالکل بے گناہ ــــ وہ دونوں بھاگے نہیں ــــ ہم خود ان کو بھگا دیئے ــــ ؟"

"مگر کیوں ؟ کائے کو ؟ " بیگم صاحبہ حق دق رہ گیئں

" اس واسطے بیگم کی ہم ان کا دل نیئں توڑ سکتے تھے. وہ لڑکا چاہتا تو ہماری بچی کو بھگا کو بھی لے جا سکتا تھا. مگر ہم خود اپنے کانوں سے سنے اس نے بولا تھا، " میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا ــــ" یہ شرافت ہر ایک میں نیئں پائی جاتی، بیگم نسلوں در نسلوں خون چھنتا ہے تب یہ شرافت نصیب میں آتی ہے . جب ہم دیکھے کہ دونوں جی جان سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں ــــ مگر ہماری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کرسکتے ــــ تو ہم خود ہی ایک رات گاؤں لے جا کر دونوں کا نکاح پڑھوادیئے اور یہ بات گاؤں

کے صرف چند ذمہ دار اور معتبر لوگ جانتے ہیں ، بس ۔"

"پھر جب آپ خود ایچ نکاح پڑھوا دیئے تو اتنا غم کاہے کو لے کر بیٹھے ۔" بیگم جھلائیں ۔

" بیگم ، ذرا اس باپ کے دل کے بارے میں سوچو ۔ جس کی ایک ہی بیٹی ہو ۔ جس کے دل میں یہ ارمان ہو کی زوردار برات آئے ، سارا شہر امڈ آئے ۔ اتنا دان دہیز دے کہ یہ گمان ہو کہ بازار کا بازار اٹھا کر دے دیا ہے ۔ ہمارے کیسے کیسے ارمان تھے بیگم ۔ لیکن ہم اپنے خود کے ارمان کچل سکتے تھے ۔ اپنی بٹیا کا دل نئیں توڑ سکتے تھے ۔ ہمیں اعتراف ہے بیگم ، ہم یہ طعنہ سن سکتے تھے کہ نواب صاحب کی بیٹی بھاگ گئی ۔ لیکن ہم یہ نہیں سہہ سکتے تھے کہ کوئی یہ کہے کہ نواب صاحب نے اپنی بیٹی ایک نوکر سے بیاہ دی ۔ ہم کو خوشی ہے بیگم کی ہماری بیٹی ایک اچھے آدمی سے بیاہی گئی ۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا یہ ہماری جیت ہے یا ہار ۔"

بیگم صاحبہ نے ان کے پر جلال چہرے کو غور سے دیکھا ۔ جس پر غم نے اپنا سایہ ڈال دیا تھا ۔ لیکن وہ کیسے مان لیتیں کہ ایسا جگمگاتا ہوا مہربان چہرہ بھی ہارا ہوا کہلایا جا سکتا ہے ۔ ؟ ۔

نکوّاللہ

ایوّ میرا دل ۔۔! اسنے میرا دل کیسے سوکھے مارے پتے ویسا لرز راجی ۔۔!!
ایو میرے ہاتھاں پادان لیسے ٹھنڈے کاٹے کو پڑگئیں مولیٰ ۔۔! ابھی ابھی تو مئیں چھوٹے پاشا کے سنگات انون کے ہولڈال کے بنان کس لئے رتی تھی ۔۔۔ ابھی ابھی تک کا تو مئیں اپنے آپ کو ہیچ دنیا کی ایک رہنے والی معلوم پڑتی تھی ۔۔۔ پن اب میرے کو کیا ہوگیا ۔۔! میرے میں یہ ہمت کاں سے آگئی تھی۔ کبھی دخت تو مئیں ویسی حرکت نئیں کری ۔۔۔ پن اب ۔۔!

مئیں تو اس محل کی دہ پالکڑی چھوکری تھی جو کوئی کو، کسی موسے پر نکو نئیں بولی ۔۔۔ جو، جو بھی کام بولے، کر دی۔ کرکو نہ دیتی تو کرتی بھی کیا مئیں ۔ میری ہمت اچ کیا پڑتی کی بڑے بڑے پاشا لوگاں کو نکو بولتی ۔۔۔ ایسا بھی تو دخت آیا کی کالے کالے راتوں کو جب کی ٹھنڈے ٹھنڈے ہوایاں چل رئے ہوتے مئیں مزے میں خر خر پڑی سوتی ہوتی کی کوئی نہ کوئی آن کو جگا دیتے ۔

"ایو نواب زادی اُٹھ — گوری پاشا کے کمرے کے انگاران کلس کو کلس گیئں۔ جا ببرچی خانے سے انگاران بھر لے کو آ —"

اور میرے کو آتی رات کو، ایسی پکّی نیند سے اُٹھ لے کو جانا چ پڑتا۔ اپنے کمرے سے ببرچی خانے کو جانے تک کا؛ میرے ہاتھاں، پاواں ٹھنڈے ہو ہو کر سکڑ سکڑ جاتیں — پن پاشا لوگاں کا حکم ٹالتے نہ بنتا۔ میں تو دھنا دھن جوتے چپلاں کھا کھا کو بھی چُپ چاپ چ رہی، پھر اب میرے کو یہ کیا ہو گیا تھا —! میرے میں یہ نئی خوت، یہ نئی طاخت کاں سے آ گئی تھی؛ آج کے دن میرے کو ایسا کیوں معلوم پڑا کہ میں بھی کوئی چیز ہوتی —!!

ابھی ابھی تھوڑی دیر اوّل کی تو بات ہے کی بڑے پاشا جھپا جھپ ایک ایک کام کروا لے رہے تھے۔ ہاتھ میں کاغذ لے کو اُون ادھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر دوڑ دوڑ کو آ جا رہے تھے۔

"وہ بڑا اگلدان رکھ لیئے کیا نئیں، جو میں مُرادآباد سے لایا تھا۔"

"وہ چاندی کا پاندان رکھے کیا نئیں جی، جو بڑی پاشا جہیز میں لے کو آتے تھے۔"

"اُسکے وہ صراحی بھو لے تو نئیں جس میں گرمیاں بھی رہو تو پانی ٹھنڈا چ ہو کر نکلتا —"

یہ سوب ابھی ابھی کے تو باتاں ہیں ناجی — پن اب کے اب میں میں کیا کر ڈالی۔

ہندوستان بٹا سو وخت میں بہت چھوٹی تھی۔ خد وَد تو اچھا تھا، پن عمر چھوٹی چ تھی۔ اتی چھوٹی کہ امنی میرے سر کے بالاں یہ بول کر مونڈ دی تھی،

کی لڑکیوں کے سرپہ جو پالا کے جو پالا خوب گھنے بالا پنج اچھے دکھتے ۔ میرے کو میری عمر کا حساب یاد نئیں ـــــ پن کی اِتا یاد ہے کی محل کے مولانا کے آگو، سب پاشا لوگ کے ساتھ میں بھی بیٹھا کرتی تھی ۔ نئیں میں کاٹے کو بیٹھتی ۔ ایسا کیا میرے کو پڑھنے لکھنے کا شوخ تھا ، وہ تو میری امّی کو بڑا سوتلہ تھا کی میرے کو پڑھنا لکھنا آجاتے ـــــ مولانا کے آگو میں بیٹھتی تو تھی پن دوسرے بی بی لوگاں میرے کو بات بے بات ، کام رہو چاہے نہ رہو ، البتہ کرکو اُٹھا دیتیں ۔ اُن لوگاں شاید یہ چاہتے ہوں گے کی نوکرانی کی بیٹی ہے اس کو کاٹے کو پڑھنا لکھنا ہونا ـــــ مگر ہوا ایسا کہ اُسی اُٹھک بیٹھک میں بچ میرے کو پڑھنا لکھنا آ گیا ۔ ابّا امّی کے پاس گاؤں سے کوئی خط آتا تو میں پڑھ کو سُنا دیتی ہور امّی کو جواب دلوانا ہوتا تو میں لکھ کو دے ڈالتی ـــــ امّی کو بڑی خوشی ہوتی ، کی مولیٰ نے وہ دن بھی دکھایا کی میری بیٹی خلم چلانا سیکھ گئی ۔

ہو تو میں یہ بول رہی تھی کی جب یہ ہندوستان بٹا سو وخت میں بہوت چھوٹی تھی ـــــ پھر بعد کو بوا یوں کی میں ہولکے ساتھ ساتھ بڑھنے لگی ۔ امّی کو حیرت ہوتی تھی کی نئیں پن میرے کو تو لگتا تھا کی بیٹھے بیٹھے میں بڑھتی بچ جارہی ہوں ۔ جو چھوٹے بی بی لوگاں میرے ساتھ کے تھے اُنون تو جیسے وہاں کے وہاں بچ تھے پن میں تو اکدم لمبی ہوتی جارہی تھی ۔

اُنے معلوم نئیں ہمارے محل والوں کو کون ایسی ہوندی سیدھی پٹی پڑھائے کی سب کے سب لوگاں اکدم سے پاکستان پاکستان بول بول کو اُدھر چ گھسنے لگے ۔ اب میرے کو اتّا خیال تو نئیں پن یہ اچھے طرحوں سے معلوم ہے کی جب سو جانے کے باتاں کرتے تھے تو کوئی یہ نہیں بولتا تھا کی میرے کو اور امّی

کو بھی لے کو جاتیں گے ــــ وہ دناں لیسے تھے کی میں ہرنی کے ویسا جگو جگو اُڑتی پھرلیتی تھی۔ایک دن ایسا بیچ میں، بغیچے کے پچھواڑے میں، کچی روش سے ہٹ کو کچے پکے امیاں توڑ رئی تھی کی اندر سے باتاں کرنے کی آواز آئی۔ بڑے پاشا بول رہے تھے۔

"ہم کو کیا وہاں جاکو لنگرخانے کھولنا ہے کیا ــــ؟ اب اتنے دناں رکھے سو رکھے اب سوب کو چھٹی دے کر ٹرھا دیو۔"

مئیں کچھ بات تو سمجھی کچھ نئیں سمجھی۔ ایک قدم آگے بڑھائی اور کھڑکی سے لگ کو کھڑی ہوئی۔ پھر شاید بڑے ماموں بولے: "تو کیا پاکستان جاکو آپ لوگاں چولہا چکی سنبھال نے کو رہیں گے۔؟" یہ بات شاید بڑے پاشا نئیں سوچے تھے۔ اُنوں تھوڑی دیر تو غپ چُپ رہے، پھر بولے:۔

"ایسی بات ہے تو جو جو نمک حلال نوکراں ہیں اُن اُن کو سمیٹ لینا ــــ،"

اور آگے جو باتاں چلے تو یہ سُن کر میرا خون کھول کر رہ گیا کہ نمک حلالاں کی فہرست میں میری امنی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا ــــ!! اوئی پاشا یہ تم کیسا باتاں لے کو بیٹھیں۔مئیں اپنے آپ میں بولی ــــ بھلا میری امنی سے بڑھ کو نمک حلال تم کو کہاں ملتی ہور کہاں ملی۔! کیا تم وہ دناں بھول گئیں کی جب میری ماں تمہارے محل میں نوی نوی آئی تھی ہور اپنے گلے کی بھولی جیسی بکری کی طرحاں سے بولائی بولائی پھرتی تھی ــــ!! پھر یہ تیج تو تھے نا کی ایک رات کو تم نے میری ماں کے ہاتھ پکڑے، پھر پہونچا پکڑے ــــ ہور اب آگے کیا بولوں ــــ؟ میری ماں آخر کو بھی غریب گھر کی تھی۔ تمہارے ٹکڑوں پو آکو پڑ گئی تھی۔ اور یوں پالکی بن کو مشہور ہوگئی تھی۔ یہ تمہارا حیدرآباد بھی خوب ہے پاشا۔ نوابوں کا

یہ دیش اندر سے کیسا کالا ہے۔ حیدر آباد نگینہ نگمینہ؟ نیچے مٹی اوپر چونا ــــ اب کوئی کیا سمجھے یہ اوپر سے جھم جھم چمکتا تمہارا حیدر آباد اندر سے کیسا کالا کلوٹا ہے۔ یہاں پر تو عزتوں کو تم لوگاں ایسا نیلام کرتے کی کوئی موئی بھاجی بھی ایسا نئیں بیچتا۔ میری ماں اپنی زندگانی کے سارے سکھاں، سارے ارماں، سارے آرزوان بھول بھال کو تو تمہارے در آکو پڑی اور اوپر سے تم ایسا بولتے کہ اُنے نمک حلال نئیں ــــ خوب ہے تمہاری بادشاہت۔

میری ماں قسمت کی ماری اُنے کیسا توکر کے بڑے پاشا کے محل میں آگئی اب میں حیدر آباد کی رہنے والی ہو گئی تو میرے کو یہاں کے تمام ریتاں، رسماں طوراں، طریقے معلوم ہو گئے۔ یہ حیدر آباد کا رواج چلن ہے کی اچھلے بھلے لڑکیوں کو بڑے لوگاں نے لے کو پال لیتے اور اُنوں بے چارے پالکڑے کے نام سے مشہور ہو جاتے ــــ پالکڑے بولے تو پالے ہوئے۔ میری امی بھی ویسی پچ بدنصیب تھی۔ پہلے تو بڑے پاشا دلہن سے طے ہوا تھا کی اُنے چار پانچ مہینے کام کرلے کو رہیں گی۔ کبھی اچھے طرحوں سے کام کری تو آگے ہمیشہ کو رکھ لیں گے۔ مگر چار پانچ مہینے تو چھوڑ چار پانچ دناں بھی گذرے نئیں تھے کی اُنے میری امی بڑے سرکار کو پسند آ گئی اور ایسی ہی چلبلا کر پسند آ گئی کی اُنون میری نانی سے میری ماں کو ہمیشہ کے واسطے خرید لئے۔ اور یوں میری ماں جو تھی تو پالکڑی بن کو رہ گئی ــــ!

مگر امی کی قسمت بری تھی۔ پہلے تو بڑے پاشا امی کو اپنے خواب گاہ میں، خالی پیراں، ہاتھاں دبلانے کو بلاتے رہے ــــ پھر کیا دل میں آئی تو ہور آگے بڑھے۔ سوچنے والے سوچیں گے کی گھر کے بڑے منع کرنے کو مر گئے تھے کیا؟ تو شاید

اُن کو معلوم نیئں کی یہاں کا خایئدہ تھا کی جان بوجھ کو خدمت گذاری کو باندیاں بندوڑیاں رکھتے تھے۔

"خدا دولت دیا تو اُس کا مصرف تو یہی ہے کی لڑکے بالے جی خوش کر سکتا ——؟

بڑے پاشا بھی اپنا جی خوب خوش کرے۔ یہ کون دیکھتا کی اپنی خوشی کے آگے دوسرے کی خوشی بھی ہے کی نیئں۔ وہاں تو بس سب کچھ اپن ہی اپن تھے۔ میری امی میرے سے کہتی کی جب کبھی شہر میں ڈھولاں بجتے اور براتاں نکلتے، تو میرا جی چاہا کرتا تھا کی میں نے بھی ایسی سج دھج کر دلہن بننا۔ کوئی ڈھولاں بجا بجا کو، لال لال جوڑے کو آنا اور میں نے سج دھج کر پالکی میں سوار ہو کو شرماتے ہوتے جانا مگر امی کے سنگات تو یہ ہوا کی ڈھولاں بجے نئیں، برات آئی نئیں۔ کس کی شرم؟ کدھر کی سج دھج؟ بڑے پاشا ہاتھ پکڑ کو پہونچا پکڑے، کلائی پکڑ کو بستر میں گھسیٹے اور سارے ارماناں ہوا ہو گئے۔ نہ کوئی پوچھ گچھ کرنے کو خالی تھا، نہ ایسی بڑی بات تھی یہ، بلکہ اگر کوئی پالکڑی یونہی "خالی" دکھتی تو سوب چھوکریاں چھیڑ چھیڑ کو پوچھتے کی "اُنے کیا تیرے کو کوئی پسند نیئں کرا کی خالی گھوم رئی۔" اس خالی کا مطلب اُس سے تھا جو حاملہ نہ رہتی —— جو خالی رہتی اسیں کوئی نہ کوئی کمی رہتی اور جو بھری رہتی وہ پاشا لوگ کے مزاج پر پوری اُترتی۔ میری ماں تو اچھی قسمت لائی تھی کی آتے ہی بھری بھری گھومنے لگی اور جب پھر سے خالی ہوئی تو نتیجے میں میں اُس کے گودی میں تھی۔ لوگاں کہتے میں بڑی خوبصورت پیدا ہوئی تھی —— میرے آنکھاں یہ بڑے بڑے تھے۔ گالاں خوب لال لال۔ سر پہ تو جیسے کسی نے ٹوپی ہی پہنا کر رکھے تھے جھنڈولا بالاں گھنے ہور لٹے پر رنگ بھی خوب تھا۔ کہتے میں پیدا ہوئی تو کوٹھری

یں جیسے روشنی ہو گئی۔ وہی اِچ دنوں میں دلی سے بڑے پاشا کے کوئی قوتوں کے بھائی آئے تھے۔ میرے کو آ کے دیکھے تو بولے "اتی خوبصورت بچّی کا نام تو بس سویرا رکھنا ـــ" یہ بات سُن کو سب اِتا ہنسے کی پیٹوں میں بلاں پڑ پڑ گئیں۔ "اگے صبح ہوتی تو اس کو سویرا بولتے یہ کوئی لڑکیاں بالیاں کے رکھنے ویسا نام ہے کیا لوگاں سُنیں گے تو کیا بولیں گے ـــ؟"

بولتے بھئی کی اُنوں شاعر تھے اور اپنے دل سے گیتاں جوڑتے تھے۔ اُنوں بولے۔ "آپ لوگاں تو جانواراں ہیں۔ آپ کو نام کی خوبصورتی کیا معلوم ـــ یہ اُلٹ پلٹ ناماں صنوبر، صندل، گل چمن، نو بہار، چنبیلی، گلاب، گیندا تو پُرانے زمانے کے لوگاں رکھتے تھے۔ گھر دن کو زعفران کی کیا پرکھ ـــ

اُنوں کے نام کی ابھی ہنسی اٹک رئی تھی کی ایک دم سے کہتے میری ماں نے آنکھاں کھولی اور بولی۔

"اس کا نام سویرا ہی رکھنا۔ کیا معلوم اس کا نام اُس کی زندگی کو ویسا چ بنا دے جیسی کی روشن صبح ہوتی۔"

وہ دلی والے سرکار میری ماں کے منہ سے یہ بات سُن کر بولتے اتنے حیران ہوئے کی ایک جاہل عورت نے ایسی بات کیسی بولی۔ مگر پھر ہوایوں کی میرا نام سویرا ہی رکھے ـــ پہلا پہل تو سب کو میرا نام بہوت اوکل اوکل لگا پن بعد کو سارے لوگاں عادی ہو گئیں۔

میں چھوٹی تھی پن یہ دیکھتی ہور سمجھتی تھی کی میری ماں کے منہ پر کبھی ہنسی نئیں آتی تھی ـــ دیکھنے دکھلانے میں تو وہ ایسی اچھی تھی کی پہنا اوڑھا کو بٹھا ڈالتے تو لوگاں پوچھتے کی: "انے بھئی کوئی جاگیردارنی ہے کیا ـــ؟" مگر میری

امنی تو بے چاری پہننے اوڑھنے تک کو دوسرون کی طرف دیکھتی تھی، وہ کان کی جاگیردارنی تھی۔ ویسے جاگیردار کی بیوی کو لوگان جاگیردارنی ریچ بولتے ــــ اور ویسا دیکھو تو میری امنی بھی تو جاگیردار کی، نواب کی بیوی جیسی تھی، پن اب یہ کون دیکھتا ہے ــــ !! وہ تو آسمان پو پہونچ کو بھی زمین ریچ رئی۔

جیسا جیسا میرے کو سمجھ آنے لگی میں یہ بات سمجھتی گئی کی اس گھر وائے میں تو ہنسنا بولنا بھی اپنے بس کا نیئں ــــ پاشا لوگان جو چاہ لیتیں کرتیں۔ پن اپنا تو یہی حال تھا کی قدم قدم پہ دیکھ دیکھ کو چلو ــــ میری امنی کے آنکھان ہمیشہ پانی سے بھرے رہتے۔ جب میں نے تھوڑا بہت لکھنا سیکھ گئی تب میں نے سوچی تھی کی اپنی امنی کی ایک کہانی لکھنا ــــ امنی کو یہ بات میں بولی تو اُن کو بڑی ہنسی آئی، بولے: "بیٹا کانیان تو بڑے پڑھے لکھے لوگان لکھتے۔ اپن لوگان تو ایسے ہے کی سیدھے سے بات کرنا بھی نیئں آتا۔ قلم چلانا بھی نیئں آتا ــــ آئے بیلا، تو کانیان کیا لکھیں گی ــــ"، میں بولی تھی: "امنی میں تو اب بہوت اچھا لکھنے پڑھنے لگ گئی۔ محل کے دوسرے پالکوڑی لڑکیاں تو میرے آتی اچھی بات کر سکتے۔ میرے ویسا ڈھنگ کوئی کا ہے۔"

اور یہ بات میں جھوٹ بولی بھی نیئں تھی۔ بہت دنان پیچھے دہی دلی والے سرکار آتے تھے تو اُنون بولے تھے: "سویرا تو حیدرآبادی معلوم پڑتی نیئں۔"

ہمارے پاشا نے پوچھے تھے۔ "وہ کیسا؟"

تو اُنون نے جواب دیتے تھے کی "حیدرآبادی لوگان جیسے غلط سلط بات کرتے اسنے نیئں کرتی ــــ کرتی پن آتی نیئں کرتی۔"

اُنئے بڑے سرکار جو دلی سے بار بار آتے جاتے تھے، تھے تو اُسی حیدرآباد

کے، پن جانے کیا بھید تھا کی اُدھر اُنون کچھ سالاں پیچھے حیدرآباد چھوڑ کو دلی جا بسے تھے۔ بولتے اُنھوں کبھی شادی بھی نیئں کرے۔ میری امنی یہ بات بتائی تھی کی اُنون کسی پالکڑی سے عشق کرے۔ عشق کرے پن ایسا سچا کی بولے اُسی کو بیوی بناؤں گا۔ اب دل بہلا دے پُرتے کی محبت جتاتے تو اچھا بھی لگتا پن اُنون تو اس کو باخاتیدہ اپنی رانی بنانے کا سوچ لے کو بیٹھے تھے۔ اُنون کو دادا منع کر دیئے عشق کے ایسے سچے ہور ضد کے ویسے پکّے تھے کی اُنوں سارا زمانہ چھوڑ ڈالے۔ اُٹھے ہور دلّی جا کو بس گئیں۔ پہلے تو کتے دناں پلٹے ہچ نیئں۔ پھر بہوت برسال بعد آتے تو لوگاں کہتے اُنے بالکل بدل کو رہ گئے تھے۔ تو میں یہ بول رتی تھی کی جو دلّی والا ایسے بولے کی یہ اچھی بات کرتی تو اُس میں جھوٹ بات تھوڑی ہوتی۔ پھر اُنون کے بولے پیچھے میں آزمائی تو سچّی میں دوسرے چھوکریاں ویسی جاہل نیئں لگی اپنے کو ــــ میَں یہ سوچ کو رکھی تھی کہ سچی کہانی لکھوں گی، ضرور لکھوں گی، مگر میری خسمت کی کبھی موخع نہ ملا ــــ میں بڑھتی گئی ہور یہ بات بھول گئی۔

لوگاں بولتے کہ کوئی کوئی بچیاں ایسے رہتے کی اُن کے عمراں تو چھوٹے رہتے پن اُنے دماغ بڈھوں کا لاتے ــــ میرا بھی ویساچ حال تھا۔ ہندوستان بنا سو وخت میری عمر ج کیا تھی! پن عخل بہوت بڑی تھی۔ پھر میَں وہ زمانہ بھی دیکھی جب کیا بولتے اُس کو وہ پولیس اکشن ہوا۔ پھر تو پوٹے حیدرآباد میں وہ وہ ہلو رچی کی پوچھو نکو ــــ پھر دناں ایسے بیتنے لگے جیسے شکاری کو آگے بھاگتا ہرن۔ ابھی کے یہاں تھا کہ ابھی وہاں ــــ ان آنکھاں نے کیسے کیسے زمانے دیکھ کو بیٹھیں! سال پیچھے تو محل والوں نے میٹنگ جمع کر کو یاں کتے تھے کی اب جیسا کچھ بھی خسمت میں لکھا ہے بھگتنا ــــ نہ آنا نہ جانا ــــ پن اب یہ تو اہلڑ مچا تو پھر سے

یہاں وہاں جگو جگو بیٹھ کو سرگوشیاں ہونے لگے۔ سب اپنے اپنے باتاں سُناتے کوئی کسی کو سُننے کو خالی نہیں رہتے۔ پن بڑے پاشا بیٹھ کو سب کو سُنائے کی ایسا آپس میں بکواس کرلینا اچھا نئیں ـــــ اب سوچو کون جاتے کون نئیں۔

بڑے بڑے باتاں ہوئے، پھر یہ طے کرے کی آدھے لوگاں چلے جانا، وہاں جا کے بزنسان کھولنا، ملاں چلانا، کچھ کچھ، تو سبھی کرنا، پن خالی نئیں بیٹھنا کی خالی بیٹھنے کا اب یہ زمانہ نئیں ـــــ اور جب ادھر سارے زمینان، جاگیران حکومت کے حلق میں چلے جائیں گے تب تو سب کو جاناچ پڑتا۔

اور پھر ایسا ہوا کی بہت سے لوگاں پاکستان چلے گئیں۔ پن میں نئیں گئی۔ میں بولی میری ماں جہاں رہیں گی وہیں میں بھی رہوں گی۔ ہور اب میری ماں پاکستان چھوڑ دنیا کے کوئی حصّے میں نئیں جاسکتی تھی۔ کیونکہ اُنے پولس ایکشن کے کچھ دنان پہلے مرگئی تھی۔ ہور جب ایک انسان مرجاتا ہے تو اُنے آنے جانے کے سارے سلسلے چھوڑ جاتا ہے ـــــ اُنے اب ایسے سفر پو چلی گئی تھی کی اب واپس آنچ نئیں سکتی تھی۔ امی کے مرنے کا بھید میرے کو نئیں معلوم، پن لوگاں کہتے اُن نے خودکشی کی تھی۔

میری جوانی برسات کے منہ زور بادل کے ویسی اُمڈ اُمڈ کو بڑھتے چلی آرہی تھی اور جدھر جاتی اُدھرچ اُجالے ہو ہو جاتے۔ ایسے میں میں تو چڑھتا سورج ہوتی جارئی تھی جس کو ہر کوئی اپنے دل میں بھر لے کو رکھنا چاہتے۔ (اور کتے نامان گناؤں جو ایسا کرلینا چاہتے تھے!) کہتے میری ماں ایک دن بیرچی خانے میں دوسرے پالکڑے چھوکریاں سے بولی: "میں نئیں چاہتی میرے ویسا حشر میری بچّی کا بھی ہو ـــــ" کوئی بولے: "وہ تو ایک نہ ایک دن ہو کرچ رہینگا۔"

اس پہ میری ماں نے کہی :" تو اُس گھڑی کو دیکھنے سے اچھا یہ ہے کہ میرے آنکھاں ڈھنک جانا۔"

اور میری ماں کے آنکھاں ڈھنک گئے۔ اُنے خودچ ڈھنک لی۔ امنی پاگل تھی۔ کتنی عجیب بات کری اُس نے۔ میرے کو اس طرحون سے اکیلے چھوڑ دی۔

امنی کے مرنے کے بعد جب میں نے یہ بات سُنی ہور ایک دن خالی پوچھ آئینہ دیکھی تو پتہ چلا کی ماں کی بات غلط نئیں تھی۔ ابھی ابھی تو سال دو سال پیچھے کی بات ہے کی ماں نے میرے بالاں منڈا دی تھی۔ جب میں کیسی تھی ہوراب ــــ!! لمبے لمبے بالان میرے بیٹھ پو جھول رہے تھے ہور منہ کیسا جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ میں نے اُس وقت سوچی تھی کی سچی اگر سویرا صبح کو بولتے تو مئیں سویرا ہوں۔ مگر کیسا اندھیرا اور تاریک سویرا ــــ بولتے تاجی کی صبح چمک دار، روشن، اور خوبصورت ہوتی ــــ ارمانان بھری ہوتی، آرزوان بھری ہوتی میں اوپر سے تو سچی بھی سویرا تھی، مگر اندر سے رات تھی ــــ رات کے دیسی کالی اور بھیانک ــــ نئیں تو پھر میرے دل میں ارمانان بھری روشنی کائے کو نئیں تھی ــــ!!

ادھر تو امنی مری اُدھر محل کے لوگان، آدھوں آدھ لوگان ــــ پاکستان چل دئیں ــ کیسا کیسا میرا من ترسا کی اس اکیلے پن سے، اس ڈھنڈار محل سے اس جلانے رُلانے والے گھرانے سے بھاگ کو کہیں چھپ جاؤں، پن میرے دُکھی من کو کبھی کوئی سہارا نئیں ملا۔

یہ نکو سمجھو کی سہارا دینے والے ملے نئیں۔ ملے تو ضرور پن ایسے جن کے آنکھاں، جن کے نظران زہر بھرے تھے، جن کے سانساں مار ڈالنے والے

تھے، جن کے رگ رگ میں شیطانیت اور حرام زادگیاں بھرے ہوئے تھے ۔
بہوت سے لوگاں یہ سمجھ لے کو بیٹھے تھے کی جاگیراں ختم ہو گئے ۔ حکومت نے
زمیناں لے لیں تو اب ان لوگاں کے دماغ ٹھکانے کو آجائیں گے ۔۔۔ پن ایسی
کوئی بات نئیں ہوئی ۔ وہ لوگاں تو روزِ اوّل تھے ۔۔۔ ایسے باتاں بولنے کو بھی شرم
آتی، پن ہم کو تو اپنے آنکھاں سے دیکھنا پڑتا تا ۔۔۔ میرے کو اپنی زندگی سے بیزارگی
ہوتی جارئی تھی ۔ اپنے آپ پو رحم آتا ۔۔۔ دُکھ ہوتا کی یا مولیٰ یہ بھی کیسی زندگی تو دیا ۔
اپنی زندگی سے اب تک کا تو دُکھ ہوتا تھا، خود پو رحم آتا تھا، پن اکدم
سے اب میرے کو اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ۔ اپنی زندگی زہر معلوم پڑنے لگی ۔
میرے ساتھ کے اور بھی پالکٹے چھوکریاں تھے ۔ کچھ تو میرے ویسے ہی باپ ہوتے
بھی بن باپ کے، اور کچھ غریبی کے مارے خریدے ہوئے چھوکریاں تھے ۔ اُن میں
سے ایک ستارہ بھی تھی ۔۔۔ بولتے ستارہ خالی آسمان پو جگمگاتا، ایسی اُس کی عزت
رہتی ۔ پن اُنے ستارہ ہونے کے باوجود زمین پر پھینکے گئی، بلکہ موری میں گرائے گئی ۔
ہمارے بڑے پاشا صاحب کے منجھلے بیٹے حیدر میاں نے ستارہ کو ایک
دن دیکھے بس دیکھ لئے ۔ اُس کے بعد کام نہ دھام، بہرچی خانے کے بار بار پھیرے
کرنے لگے ۔ ستارہ کی ماں بھی بہوت نمک حلال تھی کی جب اُنے دیکھی کی منجھلے
پاشا آپو آپ ہو کو یوں دولنے بن رئیں تو اُنے اپنی بیٹی کو خواب گاہ میں بھیجنا شروع
کری ۔ اس خواب گاہ کا حال میں کیا بولوں آپ سے ۔۔۔ نکو پوچھئے تو چ بھلا
ہے ۔ دہاں پھولاں بھرے سیجاں تو ہوتے تھے، پن پاشا لوگاں کے واسطے ہمارے
ایسے بدنصیباں تو دہاں پہونچ کو خود کو خصائی کے چھُری تلے کی گائے سمجھتے تھے
ستارہ بھی اسی خید خانے میں پہونچی اور خصائی کی چھُری تلے آ گئی ۔

پھر تو ستارہ کو ایک بعد ایک سبھی نے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔

جب تک اُنے منہ بند کلی رہی، سو رہی۔ پن جب اُنے پھول کے نا دکھلی تو ہر کوئی اپنے اپنے گلدان میں اُس کو سجانے لگے۔ کہاں تو اُنے پھول بن کے مہکی تھی کی ایک دن موری کا کیڑا بن گئی۔ چیاؤں چیاؤں کرتے دو تین بچے اُس کے آگے پیچھے جھولتے رہتیں —— اور پھر یہ مزہ کی ہر بچے کا باپ الگ، اُنے ایک کی صورت ایک سے نہ ملتی، سو ب الگ الگ صورتاں لے کو آئے —— اور یہ تو پھر ہے چ کی جیسا بیجاں ڈالیں گے ویسا پھل اُترے گا۔ دو چار برسوں میں ستارہ کیا تھی اور کیا ہو گئی کی دیکھ کو رحم آتا —— میں ایک دن اُس سے بولی بھی کی یہ سوب غلط باتاں کیوں کرتی تو اُس کے آنکھاں بھر آئے اور بولی: "ہمے گندی موریاں کے کیڑے کب تلک کا اپنے کو بچانے کو رکھ لیتے؟"

"تو ایک دن میرا بھی یہی حشر ہوئینگا۔" میں نے سوچی اور پھر میرے کو اپنی زندگی سے، اپنی ہر ہر چیز سے نفرت آنے لگی۔ اُس سے اچھا تو یہی ہے کی انسان مرجاتے۔ مگر پھر میرے کو خیال آیا کی مرنا تو بزدلی ہے —— ڈرنا مرنا تو ڈرپوکوں کا کام ہوتا۔ اچھے طرحوں سے زندہ رہ کو اپنے حق ہور زندگی کے واسطے کیوں نئیں لڑنا —— مگر پھر جب سب باتاں سوچ کو اپنے آس پاس دیکھتی تو خیالاں آتے کی ایسے پنجرے میں کیا بچ کو رہنا —— جہاں لوگاں ایک کونے میں اپن کو ڈال کے آس پاس خونخوار تیراں چھوڑ دیتے۔ ایک سے بچیں گے تو دوسرا آن کو گھیرینگا۔ دوسرے سے بچے تو تیسرا۔ تیسرے سے بچے تو . . . . یہ سلسلہ کہاں پر ختم ہوئینگا۔"

موہلی تو بھی عورت کو کیسا بے سہارا بنا کو رکھ دیا رے۔ پہلے تو خود چ عورت

میں ہمت کی کمی ہوتی، اُوپر سے ایسے خیدان بھی لگا دیا ــــ اب میں اپنے کو بچانے کی ترکیباں سوچی بھی تو یہ سمجھ میں نئیں آیا کی کس کا ہاتھ پکڑ دوں گی جھوٹے محبتاں، خالی خولی پیاراں جتانے والے تو بہوت مِل جاتے، دل سے چاہنے والا کہاں ملتا ــــ؟ اپنا کام نکال کو دوسروں کو بے کام کرکو چل دینا تو سب کو آتا پن وہ محبت کرنے والا دل کون سے کونے میں بستا کی جو لینے کو روتا دیکھ آنسو کے خطروں کی جگو خون بہانے کو بیٹھ جاتا۔ عورت کے دیوانے تو سب ہوتے۔ اپنا پہلو گرم کرنے کو سب سوچتے ــــ پن اُس کی زندگی، اُس کے دُکھ درد کا خیال کون کرتے؟ یہ محل والے ــ یہ درندے ــ یہ شیراں؟

"بھاگ جاؤں"۔؟ میں نے اپنے دل سے پوچھی ــــ! پھر یہ خیال کری کی بھاگ کو اتی بڑی دُنیا میں جاؤں گی کدھر ــــ دُنیا میں بھی تو آخر یہ سے لوگاں بستے ہوں گے ــ پھر ــــ؟؟

"بھاگنا ضروری نہیں ہے کچھ ــــ" میں اپنے دل کو سمجھا دی۔ ہمت سے رہے تو سچ سب کچھ ہے اپنا من میلا رہے تو لوگاں بھی آنکھیں بھر بھر کو دیکھتے۔ اپن سلامت روی کی چال سے چلے تو کسی کے باپ کا مجال نئیں ہوتی کی ایک نظر بھی پھینک کو دیکھے۔

زندگی ایسیچ گذر رئی تھی ــــ نامراد، اندھیاری ــ کی اکدم سے میرے کالے راتاں صبح میں بدل گئے۔

محل کے آدھوں آدھ لوگاں پاکستان چلے گئے تھے۔ کبھی کبھار وہ لوگاں ملنے کو آتے رہچ تھے۔ اب کے منجھلے پاشا، بڑے بچا، چھوٹے پاشا آئے تو جیسے محل بھرے میں بہار ناچ گئی۔ یہ لوگاں اب کے آئے تو بولے کی اب سوب

کو پاکستان لے جانا ہے، کیوں کہ اب یہاں پو زندگی میں کوئی مزہ باقی نہیں رہا۔
اب میں اچھی خاصی ایک جوان لڑکی تھی۔ ادھر اُدھر نکل جاتی تو ایکو ایک مرد میرے کو پچ گھورنے لگتا۔ ویسے تو لوگاں خود بولتے کی جوانی اپنی جگہ خود پچ ایک خوبصورتی ہوتی، اُس پر خوب صورت چھوکری کی جوانی ــــ!! محل میں بہار ناچی تو ناچی میرے دل میں بھی ناچی ــــ زندگی میں پہلی بار تھی کی کوئی نے سچ مچ میرے کو پیار بھری آنکھاں سے دیکھ کو مسکرایا۔ ایسے پیار سے مسکرانے والا وہ عباس تھا ــــ جب پولیس ایکشن کے وخت سب لوگاں پاکستان گیئں تو اُنے بھی ساتھ گیا۔ جب کو اُنے ایک بچّے کے مافق تھا، پن اب تو ایک اچّھا خاصا مرد وا بن گیا تھا۔ اور کیسا طرح دار اور بانکا مرد وا کی دل آپو آپ اُسکی طرف کھینچتا۔ پیار سے مسکرانے کو دیکھنے کے سوا اُنے کبھی میرے سے بات تک کرنے کی کوشش نیئں کرا۔ یہ نکو سمجھو کہ ایسے سے محبت نیئں رہتی کی بات تک تو نیئں کرا اور بول رئی کہ محبت کری تھی۔ سچی چاہت والے کا یہی رُوپ ہوتا۔ چار چھ سال اُنے پاکستان رہ کو کیا آیا کی اُنے اپنا لب لہجہ، بات چیت، چال ڈھال سب بھول بیٹھا ــــ اب اُنے بات کرتا تو ایسی جیسے چھوٹی پاشا لوگاں کو اردو پڑھانے والے ماشٹر کرتے تھے۔ کسی کو کوئی کام سے پکارتا تو ایسا کی آواز کاں میں نرم نرم لگتی ــــ چلتا تو ایسے کی زمین ہدرتی اور سینہ ایسا تنا ہوا کی جیسے کچھے نیئں یتے گولیاں کھانے کا حوصلہ ہے۔

عورت کا دل بھی میں بولتیوں کیا دل ہوتا کی جہاں پیار کی ایک ذری جھلک بھی دیکھا وہیں جھک گیا۔ اب عباس کے خیالاں آتے تو صرف عباس ہی دن میں، دماغ میں نہ آتا بلکہ ایک گھر، ایک باغ اور کھل کھل کرتے بچّے بھی آیو

آپ چلے آتے۔ بچے ـــ جو الگ الگ صورتاں نیئں رکھتے تھے۔ کسی کی ناک عباس کے دلیسی تھی، کوئی اپنے آنکھاں عباس کے ویسے لایا تھا۔ کسی کے چلنے کی ڈھب عباس دلیسی تھی اور کوئی تو چھوٹا سا عباس ہی تھا۔ بس ـــ میں تو وہ پھول تھی جو ایک ہی گلدان میں سجنے لائق تھی۔

اب تک محل میں جو سارے لوگاں تھے اُنون ایسے تیت کے، نظر کے بُرے تھے کی کبھی پینے کو پانی بھی مانگے تو جھٹ آنکھ مار دیتے۔ کبھی پان کی تھالی دینے کو اٹھی تو ہاتھ پکڑ لینے کو تیار ہو گئے۔ مگر عباس ـــ! اُنے تو بات بھی کرا تو نظر جھکا کو۔

ایک دن بغیچے میں میں ٹبے یا تنا کے سرہانے رکھنے کو گلاب کے پھولاں توڑتی تھی کی پچھ سے ایک کانٹا انگلی میں گھس گیا ـــ سی، کر کو میں اپنی انگلی منہ میں ڈال لی۔ پتہ نیئں وہاں عباس کھڑا تھا کی میری آواز سُن کو آیا ـــ آیا اور اکدم میری انگلی پکڑ لیا۔

"دیکھ کو کام کیا کرو۔ اگر ابھی زخم بن جاتا تو ـــ"

میں حیرت اور شرم سے ڈوب مری ـــ اُنے کیسی دہلی دہلائی زبان میں بات کر رہیا تھا۔ میں اپنے آپ کو اس کے سامنے ایسی حقیر لگی۔ دل بولا، ڈوب مروں ـــ میں نے اپنے دونوں ہاتھاں منہ پر رکھ لی ـــ "نکو اللہ ـــ" میں خود سے بولی یہ اِتنے اچھے آدمی سے کیا بات کردی ماں ـ"

وہ کچھ دیر تو کھڑے رہا پھر بولا۔

"لاؤ تمہاری انگلی پر پٹی لپیٹ دوں ـــ" اور ایسا بول کو وہ اپنی دستی کا کونہ پھاڑنے لگا۔

"نکو ادئر ـــ" میں گھبراہٹ میں بولی ـ" اپنی دستی نکو پھالڑو ـ ایسا کیا بڑا زخم میرے کو لگ گیا ـ" میرا دل جیسے رونے لگا ـ میں بولی: "تم اتنے سے زخم کو دیکھ کو پٹی لپیٹ دے رئیں اور جو میرے دل میں اتے سارے زخماں پڑے سو!"

وہ ذرا دور ہٹ کر بولا: "میں تمہارے سارے زخموں پہ اپنے پیار کا مرہم رکھ دوں گا ـــ بولو، مجھ سے بیاہ کر دگی؟"

یہ بادلاں، یہ ہوایاں، یہ پھولاں، یہ باغاں جیسے سوب کے سوب جھُوم جھُوم کو لہرانے لگے ـــ ہم دونو کو کھڑے کتنی کو دیر ہوئی تھی پن میرے کو ایسا لگا کی ہم کتنے زمانے بیت گئے کی یہیں تھے ـ میں نے سر اُٹھا کو اُس کو دیکھی، جانے کب تک دیکھتی رہی ہور پھر جیسے یں کسی جادو کے اثر سے آگے بڑھی اور جا کو اُس کے سینے پو اپنا سر ٹکا دی ـ اُس نے جھک کو میرے مُنہ کو دیکھا ـ

"تم کتنی بدل گئی ہو سویرا ـ تم کتنی اچھی ہو گئی ہو ـ تم تو سچ مچ میری زندگی میں صبح بن کر آگئی ہو ـ"

اور اُس نے دھیرے سے جھک کو میرے کو اپنے ہاتھاں میں سمیٹ لیا ـ اُس ایک گھڑی میں ہمارے سارے دکھاں ایک ہو گئے، سکھاں ایک ہو گئے ـ ہم دونوں اتنے قریب ہو گئے جیسے کبھی دور ایچ نئیں تھے ـ

پہلے تو عباس کراچی جا کر اپنی تعلیم پوری کرا، اُس کے بعد اُنے پاشا لوگاں کے حساباں کتاباں کی جانچ پڑتال کرنے لگا ـ اُس کے بغیر تو اب محل والوں کا پتا بھی نئیں ہلتا تھا ـ وہاں کراچی میں کہتے بہوت سے لڑکیاں اُس پر لٹو ہو گئے بہوت سے لڑکیاں اُس سے عشق لڑانا چاہے، پن اُنے کسی کو خاطر میں نئیں لایا ـ اب اُنے بولتا تھا کی بچپنے سے جب کی اُنے میرے کو دیکھا تھا، میرے ساتھ رہا

تھا، میرے کو چاہتا تھا ــــ اُنے بولتا میں اِتنے بڑے بڑے بستیاں گھوما، ایکو ایک لڑکی سے ملا، پن وہ بات کسی میں نیئں جو میرے میں ہے ۔

میری زندگی اب تک کا بڑی بُری گذری تھی، کوئی خوشی نیئں تھی، کوئی سکھ نیئں تھا۔ بس ہر وقت پاشا لوگاں کے جھڑکیاں اور بات بے بات ڈانٹاں ۔ ایک دن بھی تو ایسا نیئں ملا کی میئں ذرا مسکرا ہی لیتی ۔ ویسے مسکراتا چاہتی تو مسکراہٹاں بھی بہوت مِل جاتے، مگر میئں ویسی لڑکی نیئں تھی کی پیسوں کے بدلے میں خوشیاں خریدتی ـــ اتے زمانے میرے پہ سے گذرے، کتے پاشا لوگاں ایسے تھے کی میرے کو طرح طرح سے دغا دینا چاہے پن میں تو ایسی تھی کہ کبھی کسی کے خواب گاہ میں جھانکی تک تو نیئں ـــ ہزار موقعے ایسے آئے کی میئں یاں یاں بچی ۔ لوگاں بولتے کی اِسنے کیوں ایسی خودسر ہے ـــ یہ نیئں سوچتے کی جن کا کھاتی ہے، اُنوں کے کام آنا چ پڑتا ۔

پن میئں تو یہی بولتیوں کی دنیا میں بدی نیکی سب عورت کے ہاتھ میں ہے ـــ اُنے کبھی عورت کی مرضی نیئں تو کسی کے باپ کی ہمت نیئں پڑسکتی کی ہاتھ بھی لگا سکے ـــ مجبوری کو میئں کب نیئں مانتی، مگر عورت تو وہی کی مجبوری ہوتے بھی اپنی عزت کی ناؤ کو صاف کھے لے جائے، نیئں تو ایسے سے موت کیا بُری ہے ۔ یہ مردوں کو دلیر بنانے میں سارا ہاتھ ان عورتوں کا رہتا اُڑتے اُڑتے یہ خبر پاشا لوگاں کے کاناں تک پہونچی کی عباس ہور سویرا کا میل جول بڑھ رہا ـــــــ اب یہ اتی اہمیت کی بات تھی بھی نیئں مگر بات یہ تھی نا کی میئں کسی کو منہ نیئں لگاتی تھی، سو اب کیسے ایک دو کوڑی کے مرد کے پیچھے پڑ گئی ۔ میئں ؟ ان لوگاں سے کیا بتاتی کی اُنے دو کوڑی کا

بھی تھا تو میرے واسطے دو لاکھ کا تھا۔ کیا محبت پیسے سے کرتے کیا؟ دل دیکھتے جی دل ـــــ پن ان لوگان کو دلاں کی کیا خدر۔ یہ لوگان تو بس پیسے کے غلامان ہیں ـــ چھی ـــ مٹی پڑ دا ایسے نیتاں پو۔

میں عباس کی رانی تھی تو اپنی جگہ پو تھی ـــ پن ان پاشا لوگان کی تو غلام تھی۔ ایسے موقعے تو آتے بچ تھے کی میرے کو آن کے کاماں کرنے کو اُنوں کے کمروں میں جانا پڑتا ـــ ایسے میں ان لوگان کا بس نئیں چلتا تھا، کی میرے کو اُٹھا کے کچّا کھا جاتے۔ میں کیسی مگن اور خوش تھی کی چلو اب میرا بھی نصیب خدا نے کھولا ـــ ورنہ یہ ڈاکو آں تو میرے کو اُڑا لے جاتے۔

اب ہمارے سوب کا پاکستان جانا بالکل طے ہو گیا تھا۔ عباس نے بول دیا تھا کہ اپن پاکستان جا کو جھٹ پٹ شادی کر لیں گے۔ میں نے بولی، یہاں پر۔ چ کیوں نہیں کر لیتے۔ جتنی جلدی ہیں تمہارے سامنے میں آ گئی اتنا اچھا ـــ پن عباس بولا کی اُنے میرے کو ایسی ویسی دلہن نئیں بنانا چاہتا اُس کا پاکستان میں بہوت روپیہ جمع تھا۔ وہ وہاں چل کو زور دار شادی کریں گا ـــ ایسا اُنے بولا ـــ اُنے بڑے بڑے باتاں سوچا تھا کی اپن ایسا کریں گے، ویسا کریں گے۔ (ہم دونوں جلدی سے جلدی پاکستان پہونچ جانا چاہتے تھے) پھر گھر بھی الگ لے کو رہیں گے۔

پھر سوب لوگان پاکستان جانے کے تیاریاں کرنے لگے۔ اچھے بُرے سامان کی بیچ باچ ہونے لگی ـــ رونے دھونے ہوتے، بے ہوشیاں پڑتے ہور روپیہ حاصل کرتے جاتے اور ساتھ ساتھ سامان کی باندھا بوندھی بھی چلتی بچ رہتی۔

"یہ چیز لاؤ۔"

"وہ چیز لاؤ۔"

"وہ پاندان اُٹھا کو لا۔"

"لگے وہ گلدان سنبھال کو لا۔"

اُس دن یہ حکم احکام جاری تھے کی اُدھر سے کوئی آکو بولے کی میرے کو اُدھر چھوٹے محل میں چھوٹے پاشا بلا رئیں ـــــ اُنون کے ٹھاٹ باٹ نرالے تھے۔ انون کا سامان بھی سوب لوگان سے الگ تھا ـــــ وہ اکیلے میں باندھا بوندھی کر رہے تھے کی مئیں جا پہونچی۔

"تو بھی پاکستان چل رئی کیا ـــــ؟" وہ اپنے کوٹ کی گھڑی کرتے میں بولیں۔

"جی ہو ـــــ" میں خوش ہوئے کو بولی ـــــ "مئیں تو اپنا سوب سامان بھی بندھ لی۔"

"اچھا ـــــ!" انون کچھ دیر رُک کو بولیں ـــــ "اور پھر وہاں تیری شادی ہو جائینگی نا!"

میں شرما کو سر جھکالی تو کہے: "ہے بڑا یہ خوش نصیب عباسیا ـــــ تازے پھول پو ہاتھ مارا سالا ـــــ"

میرے کو بڑا غصہ آیا ـــــ یہ سالا دالا کائے کو تو بھی بول لے رئیں نون دبی زبان کر کو بولی: "اُنے کیا بگاڑا آپ کا ـــــ؟"

جھٹ ہنس کو کہے: "کچھ نہیں ـــــ یونہی بات دیسی بات بولا مئیں" پھر رُک کو بولتے: "اچھا سویرا پاکستان چل کو ہم تیری شادی آتی دھوم

دھام سے کریں گے۔؟

"آپ تو بہوت اچھے ہیں پاشا — کوئی تو میری شادی کا نام بھی نئیں سننے کو خالی اور آپ بول رئیں شادی دُھوم سے کریں گے۔"

اُنون میرے قریب آکو رُکے —"کیوں نئیں۔ آخر تجھ پر ہمارا کچھ حق لگتا کہ نئیں۔"

مئیں جیسے احسان میں ڈوب کو بولی: "کیوں نئیں پاشا، آپ، پچ لوگاں تھے کہ میرے کو پالے، آپ سے بڑھ کو کس کا حق ہو سکیں گا۔"

"تو وہی تو میں بولتا ہوں کہ اپنا حق کیوں نہ لیوں؟"

اب جو میں نے ہولڈال کے بنان کستے کستے سر اُٹھا کو اُنون کی صورت دیکھی تو سارا معاملہ جیسے میرے سمجھ میں آگیا۔ وہ نئیں چاہتے تھے کی یہ پھول اپنے اصل روپ میں عباس کے آنگن میں مہکے — کیوں نہ آگو ہی اس کو مسل دیوں —؟ مئیں گھبرا کو بھاگنا چاہی تو دیکھی چھوٹے پاشا سامنے بیچ۔ کھڑے ہنس لے رئے تھے —!

آخر وہ گھڑی تو میرے مقدر میں لکھی تھی پچ کی جس سے بچنے کو میری امی زہر کھالی تھی۔ پنجرے میں شیر بھی تھا اور اُنے بے بس شکار بھی! اُنون میرے قریب آکو بولے۔

"یہ گالون کو چومنا تو میری برسوں کی خواہش ہے۔"

میرا خون سن سن کرنے کو دوڑنے لگا — ہوں، تو اُنے ابھی اپنے واسطے میرے کو پھُسلا لے رئیے تھے — میرے دماغ میں اکدم سے میرے عباس کی پیاری صورت آئی؛ اور اس کی صورت کے ساتھ جیسے میرے دل میں نئی

خوت آگئی ــــ ہور میں جو برسوں سے پاشا لوگاں کا چھوٹے سے چھوٹا حکم بھی مانتی سُنتی چلی آتی تھی، اُس گھڑی تن کو بولی ـ

"یہ تو عمر بھر بھی نئیں ہونے کا ــ" ہور ایسا بولتے پچ میرے میں ساری دنیا کی طاقت آگئی ــ "میری ماں جیسی زندگی گذاری ویسی تو میں ہرگز نئیں گذاروں گی ـ میرے کو سترہ مرد نئیں ہونا ـ میرے کو ایک ہی ہونا، پن محبت کرنے والا ہونا ـ ایک چھوٹا سا گھر ہونا، جس کی میں مالکن رہنا ــ کسی کا ڈر نئیں ہونا، ڈیکا نئیں ہونا ــ"

میرے باتاں سن کو ایسا معلوم پڑا جیسے اُنون کو غصہ آگیا ـ اُنون آگو ہی آگو بڑھے چلے آتے ـ میں پیچھو ہوتے ہوتے دیوار کو جا لگی ـ اب اُنے میرے سامنے ایک اسٹول پہ پاؤں دے کو ایسے کھڑے ہوگئیں جیسے سنیما میں کام کرنے والے لوگاں ہوتے ــ میرے منہ پو جُھک کے ابھی اُنون کچھ نئیں کیا کرتے تھے کی میں زناٹ سے ایک چانٹا اُنون کے منہ پو جڑ دی اُنون میرا دہی ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لئیں ــ میں پنجہ منہ تک لے جا کو ایسی زور سے کاٹی کہ خون کا کھارا کھارا، کڑوا، کیسلا مزہ میرے منہ میں اُتر گیا ــ "سی،، کر کے اُنون اپنا ہاتھ کھینچ لئے ــ پن ابھی اُن کی ہوس تو باقی تھی! میں اِدھر اُدھر دیکھی کی اپنے بچاؤ کے واسطے کیا تو بھی کردوں پن کوئی بات عقل میں نئیں آرہی تھی ـ دل تھا کہ آجاڑ دھڑ دھڑ کرے جا رہا تھا ــ "منھی پڑ و یہ دل پو ــ" میں دل ہی دل میں بولی ــ عین مو خصے پہ دھڑک رہا تھا ـ

اکدم تیزی سے ایک ترکیب میرے کو سوجھ گئی ــ پن بات بڑھ دڑ

گئی تو؟ کچھ زیادہ کم ہو گیا تو میرے کو جیل کی ہوا تو نئیں کھانے پڑیں گے۔
پن میں بھی سوچی کہ عزت جانے سے اچھا تو یہ ہے کہ جیل ہو جاتا ــــ جیل
سے تو پھر بھی کبھی چھوٹ کو آجائیں گے ـــــ عزت گئی تو کان سے لائیں
گے ـــــ یہ سارے ہمتان میرے کو عباس کے خیال نے بندھایا۔

"میں تمہارے یاداں پڑتی حضور، میں تمہاری غلام پاتا ــــ" ایسا بول
کو میں نیچے اُن کے قدموں میں جھکی اور ایک پاؤں جو زمین پر تھا، اُس کو
پکڑ کو ایسی زور سے کھینچی کہ اُنون کا سارا تول پیچھے کو چلا گیا ـــــ دھڑ کر
کو اُنون تالو کے بل گرئیں اور دو سرچ گھڑی میں تیزی سے باہر کو بھاگی۔
دروازے میں سے نکلتے میں میں پیچھے مڑ کو ایک بار بھی نئیں دیکھی ـــــ بس ایک
خوشی تھی کہ میں اپنی عزت برباد ہونے سے بچالی ـــــ آخر کو میں اپنے
عباس کی عزت بچائی نا ــــ"

حویلی میں کیسی کی ہول رول مچ گئی۔

میں بغیچے میں آکو رُکی ــــ دم پھول رہا تھا، سانسوں سانس ہوئی
جا رہی تھی ـــــ میرے میں یہ ہمت کاں لے آئی۔ میں کتے بڑے بڑے
ہمتاں کری۔ تھپڑیں ماری، گیتنت میں نوچی، خون میں نکال دی، اور
ٹانگ کھینچ کو تالو کے بل میں اُلٹ دی ــــ اُنون کو پورا کا پورا اپٹ دی۔
پن اب حویلی میں جو ہول مچ رئی، وہ بھی ایک الگ قصہ ہو رہا۔
بڑے بڑے بوٹاں کھٹ کھٹ کرتے۔ امین لوگاں (پولس) ادھر
ادھر گھوم لے رئیں۔ کتے اُنون چھوٹے یاستا ختم ہو گئے۔ اب میرے گلے
میں شاید پھانسی کا پھندا پڑیں گا ــــ پڑنے دیو ـــــ میں وہ پھانسی کا

پھندہ چڑھا دے کا کالی پوت کا لچھا سمجھ کو پہن لیوں گی ــــ کالی پوت کا لچھا سہاگ کی نشانی ہوتا۔ لڑکیوں کو اسی واسطے تو لچھا چڑھاتے ناکہ بولتے اپنے دولہے کے نام پو چڑھتا؟ تو میں بھی تو یہ کام عباس کے واسطے، اپنے سہاگ کے واسطے اچ کری نا ــــ؟ ہور کبھی میرا مولی میرے پو مہربان رہیا ہور میں جیل جانے سے بچ گئی تو میں تو ہول اچ اپنے عباس کی ــــ میرے کو کاٹے کا ڈر۔

میرا لرزتا وا دل آپو آپ ہلّو ہلّو دھڑکنے پو آ گیا ــــ متیں سوچی تیرے کو کاٹے کو اتا ڈرنا ہونا ــــ متیں خونی کاٹے کو سمجھوں خود کو۔ متیں اپنے کو گنہ گار بھی کاٹے کو سمجھوں۔ میں کیا اُنوں کو چُپ کا چپ مار ڈالی کیا۔؟ متیں اپنی عزت بچانے کو یہ سب کری نا ــــ؟ کاٹے کے واسطے کی میرح نیا کے سب شریف عورتاں جیسی عورت بننا چاہتی :جو ستر دھکڑے نئیں کھتی جو اپنی عزت نئیں لٹانا چاہتی، جو ایک بھوت ہی بھوت محبت کرنے والا شوہر ہونا بولتی۔ جو اپنے گھر کی مالکن رہنا چاہتی ــــ جو کچھ بچ کرتے بھولے بھالے بچّے چاہتی، جو سوب کے سوب ایک دوسرے سے شکل و صورت میں ملتے وے رہنا، ہور آپس میں شکل صورت جبھی ملتی جلتی رہتی جب کی سب کا باپ ایچ ہوتا۔

نکو اللہ ــــ میرے کو رنگا رنگی صورتاں کے بچّے نکو۔

میں آپ سے بولی ناکی متیں تو وہ پھول تھی جو ایک ہی گلدان میں سجنے لائق تھی۔

نصیبے والی

نواب صاحب خط پڑھ کر بے حد خوش ہو رہے تھے۔

"...... سلطان میاں حویلی والا مقدمہ ہار گئے۔ بی پاشا اپنے میاں پر جو پاندان کے خرچے کا دعویٰ دائر کئے تھے، وہ انوں جیت لئے۔ اس واسطے آج کل انوں بے حد خوش ہیں۔ ہزار رپئے مہینے کے حساب سے جوڑو تو سمجھو کی اب انوں اپنے میاں کی پوری جائیداد ہی ہتھیا لئے جیسا کرہیں ۔۔۔ ہور بیں آپ کو لکھی تھی کی نئیں (اجاڑ دماغ پو مٹی پڑ کو جاؤ یاد چ نئیں رہتا کی پہلے خط میں کیا لکھی تھی کیا نئیں۔ اس واسطے کبھی ایک بات دو دفعہ لکھ دیا کردوں تو آپ ہنسی نکو اڑایا کرو) کی بیارک بیگم کو آٹھ لڑکیوں کے بعد خدا وند تعالیٰ لڑکا بھی عنایت فرما دیئے۔ چھٹی کی دعوت ہم سب کو بھی آئی تھی۔ میں ہاتھوں کو سونے کے کڑے دی۔ بس ۔۔

پوچھو نکو کتی ہنسی ہوئی ۔ سوب بدلنے لگے کی اب تو بیٹا ہوا ۔ اب تو تمے کم سے کم کڑے چوڑیاں مت دینا تھا ۔ مگر میں بولی سونے کی ہتھکڑی خوش نصیباں ہی پہنتے ۔ ایک مزے کی بات آپ کو بتانا بھول گئی ۔۔۔ آٹھ بیٹیاں ہونے سے مبارک بیگم اب لڑکی کی خبر کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ ٹیبل پو پڑے پڑے انوں ڈاکٹرنی سے پوچھتے بھی نئیں تھے کہ میرے کو کیا ہوا ۔۔۔ خود ہی بول لیتے تھے ۔ "اوہنہ لڑکی ہوئی ہوئیں گی ۔ " اسی مارے ابھی بھی نئیں پوچھے، جب ڈاکٹرنی خود اٹھا کو بتائی کہ لڑکا ہوا ہے تو انوں دو گھنٹہ کی زچہ اٹھ کو کھڑے ہو گیئں ۔ پھر ڈاکٹرنی خود پکڑ کو لٹا دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

ایسا مزے کا خط تھا اور یہ تیسری بار تھی کہ خدمت گار کھنکار کھنکار کر انہیں مخاطب کرنے کی جرأت کر چکا تھا ۔ مگر وہ بری طرح خط میں الجھے ہوئے تھے ۔۔۔ " ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو شائد یہ بات پتہ چلی کی نئیں کہ ممانی اماں کی چھوٹی بیٹی کی نسبت طے ہو گئی ۔ اللہ اپنے کو خود اتا نوازا کی کسی کا دیا لیا آنکھوں میں نہیں بھرتا ۔ پر سمدھیا نے والے پیروں میں سونے کے سوا سیر کے پازیباں لائے تو یہاں سب بٹا بیٹ دیدے مارنے لگے ۔ میں تو ملو اٹھ کو گری کے بہانے آنگن میں چلی گئی ۔ اب یہ نکو پوچھو کی کیوں ۔۔۔ ایک بات ہور لکھنے کی رہ گئی ۔ میں ایسا سنی کہ بڑے چچا اپنی کنواری بیٹی کو ڈاکٹرنی بنانے کے واسطے حیدرآباد بھیج دیئے ۔ کیسا خراب زمانہ آگیا مولی ۔ اب ذرا سوچو اتنے کنواری چھوکری کتے بڑے بڑے باناں شادی سے پہلے اچ دیکھ لیں گی ۔ خیر اپنے کو کیا ۔۔۔ ہور تو گاؤں میں سب خدا کا فضل ہے

کتے فصلاں اب کی خوب بہار پر ہیں ۔ خاص طور سے چاول، پھلی، دھان تو خوب پھلا ہے ۔ میں تو بھوت دناں ہوئے ڈیوڑھی سے باہر قدم بھی نہیں نکالی ۔ گٹھیا کے مارے جان عذاب میں ہے اجاڑ۔ آپ کیسے ہیں لکھنا۔ ہور یہ بھی لکھنا کی آپ کو میرا یہ "روزنامہ اخبار" پسند آیا کی نہیں۔

آپ کی تابع دار

بیگم صاحبہ

یہ بڑے مزے کی بات تھی کہ تابع دار لکھنے کے باوجود بڑی نواب ہمیشہ خود کو بیگم صاحبہ لکھتیں ۔ نواب اپنی ان بیگم کی تحریر کے دیوانے تھے ہنسی سے ان کے خط کو "اخبار" کہا کرتے کہ دنیا جہان، بھرے خاندان کی خبریں ان کے خط سے مل جایا کرتی تھیں ۔ وہ بیچاری کوئی ایسی بوڑھی نہیں ہوئی تھیں ۔ یہی پینتیس، چالیس کے پیٹے میں تھیں لیکن گٹھیا نے مار رکھا تھا ۔ انھوں نے اپنی بیماری کی وجہ سے گاؤں آباد کر لیا تھا اور نواب کو کھلی چھٹی دے گئی تھیں ۔ ساتویں تک تعلیم پائی تھی ۔ اس تعلیم کا بدلہ اب یوں چکا رہی تھیں کہ ہر خط یہ خط پورے خاندان میں دوڑ لئے جاتیں نواب صاحب، تو کہتے کہ شراب کا نشہ ایک طرف اور بڑی بیگم کے خطوں کا سرور ایک طرف ۔ جب بھی گاؤں سے ان کا خط آتا وہ بار بار پڑھتے اور لطف اٹھاتے ۔ مگر آج .... کمبخت پھر کھنکارا ۔

انہوں نے سر گھما کر غصے سے دیکھا اور کہا "یہ کیا نامعقولیت ہے ؟" مگر گردن گھماتے ہی جیسے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ لمبی قطار سوکھے مارے قحط زدہ کسانوں کی .... خیر قطار کو مارو گولی ۔ قطار کے کونے پر کوئی اٹھارہ

سال کی جوان اور بھرپور فصل لہلہا رہی تھی - سچ مچ کے گیہوں کا چمکتا رنگ نئی کوری صراحی کی طرح سنسناتا بدن کہ جس پر پانی کا پہلا چھینٹا گرے تو سَن سَن بولنے لگے - مگر ایسی کہ کروٹ سے لیٹے تو جسم میں ایسا گڑھا بیچ میں پڑجائے جیسے اس میں چوڑی بھی ڈھیلی ڈھالی ہو جائے گی - اور کم بخت کے بال! ساری زندگی حیدرآباد میں گزری - عمر بھر دیکھتے رہے - یہ مامائیں، اصلیں - خواصیں، کنیزیں - چاول کے ساتھ املی کا کھٹا "کٹ" کھا کر عمر گزارنے والی مخلوق کٹ پکاتے سمے جو املی کے پھوک بچ رہے تھے اسی میں گیہوں کا تھوڑا آٹا ملا کر لئی جیسی "اٹکل" بنالی اور سر میں تھوپ کر نہا کر اٹھ کھڑی ہوئیں - یہی ان کا شیمپو ٹھیرا - اور اسی نامراد شیمپو سے کیا جھبکا جھول بال بڑھتے تھے - مگر یہ بھی تو انھیں میں کی ایک نظر آرہی تھی اور اس کا شیمپو بھی یہی املی کے پھوک کا "اٹکل" رہا ہوگا - لیکن یہ بال تھے کہ چڑھتی ندی - ماتھے سے شروع ہوئی تو سیدھی ایڑیوں تک جا اتری - تیل سے بیگانہ، الجھے ہوئے، خاک دھول میں اٹے، مگر اُف! اُف! سرد موسم کے باوجود انھیں اس قدر شدید گرمی لگنے لگی کہ وہ پنکھا پنکھا چلا اٹھے - خدمت گار نے ہڑبڑا کر فرشی جھالردار پنکھے کی زرکار ڈور تھام لی - دھیرے دھیرے ان کے حواس واپس آنے شروع ہوئے - حوصلہ پا کر خدمت گار نے عرض کی "حضور کی خدمت میں مختار صاحب حاضر ہونے کو پوچھ رہیں -"

مختارِ عام اپنی سنہری کلاہ سر پہ جماتے ہوئے برآمد ہوئے اور بے حد شائستگی سے، آواز کو اس قدر سریلا بنا کر کہ زنخوں کی سی ڈھب آگئی، سر جھکائے جھکائے بولے "ہر سال کی طرح اس سال بھی دیگن بھر کر قحط زدہ کاشتکار حضور کے در پہ مالی امداد کے بھروسے آئے ہیں۔"

نواب صاحب نے ذرا سی ذرا سر اٹھا کر نگاہ ملا کر دیکھا۔ مونہہ سے کچھ بولے نہیں، مطلب یہ تھا کہ بیان جاری رہے۔ اور بیان جاری رہا۔

"ان میں سے چند ایک تو حضور کے دولت کدے پر سال بھر غلامی کے عوض صرف پیٹ بھر کھانے اور تن بھر کپڑے کے طلب گار ہیں اور چند..."

"ہور چند ——" نواب صاحب نے اچانک بات کاٹ دی۔

"اور چند زمینات چاہتے ہیں۔ بہت ہلکی شرائط پر"

تنی ہوئی گردن ایک "ہم" کے ساتھ نیچے جھک گئی۔ تین بار جھکی بھی اور مطلع صاف ہو گیا —— اب وہاں صرف مختار عام رہ گئے تھے، جو شائستگی کی حدود کو اس قدر شرارت سے پہنچ چکے تھے کہ دوہرے ہو کر رہ گئے تھے۔

"زمینات مانگنے والوں کو زمینات دے دیجئے۔"

"بہتر ——"

"اور حضرت ایک بات بتائیے۔"

"جی سرکار ——"

"سال بھر غلامی کرنے والوں میں عورتاں زیادہ ہیں یا مرد —؟"

"جی حضور، عورتیں تعداد میں بڑھ کر ہیں ——" مختار عام نفیس لکھنوی لہجے میں فرمارہے تھے۔ لیکن چند خواتین اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ ہیں۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد نواب صاحب نے پوچھا۔ "اور وہ جو کوری صراحی کی طرح سنسنا رہی تھی، کیا وہ اپنے کمہار کے ساتھ آئی ہے —؟"

لیکن یہ جملہ مختار عام نے نہیں سنا۔ کیونکہ یہ جملہ دراصل صرف حضور کے ذہن نے سوچا تھا۔ زبان سے ادا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس لئے اونچی آواز سے

انھوں نے پوچھا " اور وہ گندی سی چھوکری جس کے ٹوریاں اس کے ایڑیوں کو چھو رہے ہیں، اُسے ؟"

مختار عام لجلجے لہجے میں گھگھیائے ۔ " حضور خادم کو ابھی اتنی تفصیل نہیں معلوم ہے ۔ اجازت ہو تو یہاں بلوالوں ؟"

تھوڑی دیر میں بھاری پردہ اٹھا اور بجلی سی لہرا کر رہ گئی ۔ پھر ایک پیلے سوکھے مارے چوبیس پچیس سال کے مردنے ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا اور دہرا ہو کر سلام کیا ۔ لڑکی کھُس کھُس کر کے ہنسنے لگی ۔ مرد نے دھیرے سے اسے ڈانٹ کر پوچھا " تو نے سلام کری گے ۔ ؟"

وہ بے باکی سے بولی " میں کائے کو کروں ؟ کیا میرے کو امام بلا کی جھک جھک کر سلام ٹھونکوں ؟ " پھر کھن کھناتی ہنسی کے ساتھ بولی " چُپ کے چُپ !"

مرد ڈر کے مارے ساری جان سے پیلا پڑ گیا ۔ مگر نواب کو یہ شوخی لے ڈوبی ۔ مسکرا کر بولے " انعام بھی مل جائے گا ۔ " اور جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں انھوں نے اسے کھا ڈالا ۔

تفصیل سُن کر نواب صاحب کو پتہ چلا کہ دھان کی فصل کی کٹائی کے بعد روز مزدوری کرنے والوں کی کھیپ کی کھیپ " جو ہر سال بیکار ہو کر اضلاع سے حیدر آباد دکن کا رخ کرتی ہے ، ان ہی میں یہ جوڑا بھی آیا ہے ۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جو نصیبوں سے فصل اچھی ہو یا بُری ، سدا قحط زدوں میں شمار ہوتے ہیں ۔ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے ۔

مرد اب اس بات کا طلب گار تھا کہ چھوٹی موٹی زمین کا ایک ٹکڑا

اسے گاؤں میں نواب بدیار جنگ کی جاگیر سے عطا کردیا جائے۔ اور چونکہ زیور گہنا رہن رکھنے کے لئے کچھ پاس ہے نہیں۔ اس لئے زمین کے عوض سال بھر کے لئے اس کی جورو کو غلامی میں لے لیا جائے۔ یعنی محل میں اس سے جھاڑو لگوائی جائے، یا پودوں میں پانی ڈلوایا جائے۔ یا چاول کھٹوائے جائیں یا مرچ مسالہ پسوایا جائے۔ سال بھر کی آمدنی سے پھر وہ نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کرے گا۔

نواب صاحب نے ذرا کھینچے سے پوچھا "میاں خالی زمین کا ٹکڑا لے کو تم چاٹیں گے کیا۔؟"

"جی نئیں حضور ۔" وہ ہاتھ ملتا ہوا بولا ۔ "میں ترکاریاں بویوں گا حضور کو شائد نہیں معلوم کہ بھنڈی کی فصل بہت جلدی جلدی اُترتی ۔"

"ایک شکل یہ بھی ہو سکتی نا کہ دونوں مرد جورو ادہرچ کوئی کام کرلیو ۔"

وہ معذرت کے لہجے میں بولا ۔" نئیں حضور مرد آدمی ہوں ۔ کبھی ایسا گھر دار کا کام میں نئیں کرا، کی روٹیاں تھوپ لیتا بیٹھا۔ یا مرچی کوٹ لیتا بیٹھا ۔ میرے کو تو سرکار باہر کے کام اِچ اچھے لگتے ۔ ہور سرکار اصل بات یہ کی عمر بھر سے کھیتوں میں کام کرنے کی عادت پڑی دی ہے ۔"

بیچ میں وہ پٹاخہ بول پڑی ۔"مرد ذات گھر کے اندر کاماں کریں گا تو کیسا لگیں گا ؟" اور ساتھ ہی کھس کھس کرکے زور زور سے ہنسنے بھی لگی ۔" سرکار مردوے تو دھڑم دھس کاماں کرتے اِچ بھلے لگتے ۔" اور اس نے بڑے غرور اور پیار سے اپنے مرد کی طرف دیکھا ۔ اچانک اس کے لہجے میں غم سمٹ آیا ۔ "ابھی تھوڑے دناں پہلے دیکھتے سرکار اس کو ۔ ایسا موٹا کٹا

تھا کہ پوچھونکو۔ شیر چیتا ڈر کو پیچھے ہٹ جانا، پن اپنے نیئں ہٹنا۔ اب کھانے کو نیئں تو کیسا سوکا پڑ گیا۔"

مرد کے کاٹو تو بدن میں شاید ہی دو چار قطرے خون نکل پاتے، جو محفلو اونچی جگہوں پر جانے آنے کا ذرا عادی ہو وہ تہذیب آداب سے بھی کچھ واقف ہو۔ وہ تو کئی بار بڑی بڑی ڈیوڑھیوں حویلیوں میں ہو آیا تھا، اسی لئے اسے پتہ تھا کہ صدر دروازے سے داخل ہوئے بعد آنکھوں کا کام صرف زمین دیکھتے رہنا ہے۔ اس کمبخت نے کبھی ایسی جگہ قدم رکھا ہی نہیں تو جانتی بھی کیسے کہ بڑے لوگوں سے بات کرنے کے بھی چند آداب ہوتے ہیں، یہ نہیں کہ اپنے ساتھ کام کرنے والیوں کی طرح نواب حضور کو سمجھ لیا اور لگی ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے۔ مگر اس وقت تو اس کی اتنی ہمت بھی نہیں ہو پا رہی تھی کہ اسے ٹوک ہی دیتا۔ لیکن اس کے خدشوں کے برخلاف نواب صاحب اس بٹاخہ کی باتوں سے بے حد محظوظ ہو رہے تھے۔

" سرکار آپ ہمنا اِتّا بڑا زمین کا ٹکڑا دیو کی ہمارے سارے دلدراں دُور ہو جانا۔ اُجاڑ دو برساں شادی کو ہوئے ایک سُکھ بھی نیئں دیکھی۔" پھر ایک ہاتھ سے اپنے گھور گھنگور بال جھلا کر جھلاہٹ سے بولی۔" مہینہ بھر بھر تو سر کو تیل نصیب نیئں ہوتا۔"

اب کی مرد بھی تاؤ کھا گیا۔" پاؤ بھر تیل تو ایک دفعے میں اس کے سر کو ہونا سرکار۔ اتی دفعے بولا کی اِتّے لمبے بالاں رکھ کو کیا کرتی۔ کاٹ ڈال سُنتی بھی تو نیئں۔"

وہ ناک چڑھا کر بولی "عورت کو پالنے جتّا حوصلہ نیئں تھا تو

شادی کلئے کو کیا رے کنجڑے ؟" اور ایک دم ہنس پڑی - مرد بھی ہنسنے لگا - نواب صاحب کے لئے یہ سب کچھ بڑا انوکھا، بڑا عجیب، بڑا حسین سا تجربہ تھا۔ ان کی ساری زندگی بُری طرح مصروفیات کا شکار تھی۔ زمین کورٹ کچہری، مقدمے اپنے پرایوں کے جھگڑے — دوسری طرف دعوتیں پارٹیاں، خاطر مدارات، رت جگے، رات گئے تک مجرے، طوائفیں، ناچ گانے — بڑی بیگم گاؤں لبسائے بیٹھی تھیں - اس کے بعد دو تین شادیاں منہ کا مزہ بدلنے کو کیں - جو اچھی شکل نظر میں بھری اسے داشتہ رکھ لیا - سارا "حرم" پٹا پڑا تھا - یہ پیار محبت، یہ نوک جھونک، جو ازل سے ابد تک کے لئے خدا نے مرد عورت کو خوش ہو کر ودیعت کی ہوگی، اس کا ان کی زندگی میں دور دور پتہ نشان نہ تھا۔ ایک عجیب و غریب خواہش نے ان کے سینے میں سر اُبھارا — "اس تن تنہائی جوانی کی نوک جھونک کا شکار اگر میں ہو جاؤں — تو؟"

"تم اپنا نام نہیں بتائے ابتک —" انھوں نے لڑکی سے اچانک سوال کر ڈالا۔

"پھجّو" وہ بڑے فخر سے بولی

"پھجّو؟" نواب صاحب حیرت سے بولے —" یہ کوئی نام ہوا بھئی؟"

مرد حوصلہ پاکر بولا — "سرکار اس کا نام توشہ زادی ہے۔ سب لوگاں پیار سے بگاڑ کو پھجو کر دیئے۔"

"سوب نہیں اکیلا (اکیلا) تو اچ بگاڑا -" وہ پھر لڑائی مول لینے پر تل گئی -

مرد کے چہرے پر وہ پیار بھری خجالت چھاگئی - جو صرف ایک مرد کو

ہی جچتی ہے ـــ جیسے زیر ہوکر بولا ـ" سرکار آپ اس کی باتاں پو کان نکو دیو ـ"

(کان میں دینا بھی نہیں چاہتا، کیونکہ بہن دل سے جڑکا ہوں ـ) نواب صاحب نے ہڑبڑا کر مختار عام سے کہا ـ" دل شاد پور کی نہری بالی والی زمین کا وہ بڑا کھیت ـــ کیا نام ہے میاں تمہارا ؟"

"جی سرکار ـــ عزیز ـ"

"ہاں، انوں عزیز میاں کو دلوا دیو، بیج وغیرہ کے واسطے اوپر سے سو روپے بھی دلوا دیو ـ"

عزیز بے ہوش ہوتے ہوتے بچا، لیکن اگر اسے پتہ ہوتا کہ نواب بدیار جنگ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اگر وہ جانتا کہ ان کے پرکھوں نے کبھی کسی سائل کو سفید دھات یعنی چاندی تک خیرات میں نہ دی، جب دیا سونے کا سکہ ہی دیا. تو شاید اسے اتنی حیرت نہ ہوتی. ہر سال کی طرح امسال بھی جتنے گاؤں اور اضلاع سے دیہاتی آئے تھے ڈیوڑھی میں کھپ گئے ـ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی. بچے بھی، مردوں میں سے کوئی خان ساماں کی مدد کو لگ گیا ـ کسی نے جھاڑ فانوس کی صفائی اپنا لی، جتنی بڑی ڈیوڑھی اتنے ہی پھیلے ہوئے کام ـ عورتوں میں سے کچھ پاشا لوگوں اور صاحب زادیوں کے ذاتی کاموں پر لگائی گئیں ـ چند باورچی خانوں میں، مسالے مرچ، سبزی، ترکاری بنانے پر جٹ گئیں ـ کوئی نواب صاحب کا حقہ بھرنے پر، کوئی ان کے پیر دبانے پر، کوئی انھیں جگانے پر کوئی سلانے پر مامور ہوئی. جاموں کی طرح سب کی سب گردش میں آگئیں ـ

لیکن شہزادی نہ تو ساقی بنی نہ جام ۔ نواب صاحب نے زنان خانے میں حکم بھجوا دیا تھا کہ شہزادی عرف چھجو نام کی ایک لڑکی کو کسی سے متعلق نہ کیا جائے ۔ وہ کھاتی پیتی، مزے میں دندناتی ساری ڈیوڑھی میں ہرنی بنی پھرتی ۔

سیر سپر کرتے اتنے سارے دن نکل گئے ۔ نواب صاحب کن حالوں کو پہنچ گئے، کسی کو اس کی خبر نہ تھی ۔ بڑی نوابن کے لمبے لمبے اخبار نما خط آتے پڑے سڑتے رہتے، وہ انھیں چھو کر بھی نہ دیکھتے ۔ مجرے، رت جگے ناچ گانوں کی محفلیں جیسے سب ساتھ چھوڑ گئیں ۔ بس جان بوجھ کر خود کو کاموں میں غرق کئے رہتے ۔ زنانے میں بھی کم ہی جاتے ۔ اتنے دن بعد ایک بار کسی کام سے گئے ۔ بیچ کا دروازہ اندر سے بند تھا، اس لئے نوکر خانے سے ہوتے ہوئے گئے ۔ سامنے "پرچھتی" میں شہزادی کھڑی نہا کر بال سکھا رہی تھی ۔ انھیں ایسا لگا کہ ان کی آنکھوں کی بینائی زائل ہو جائے گی ۔ جسم سچ مچ کا پنکھ بن کر، جھل جھلا رہا تھا کم بخت کا ۔ بالوں میں وہ سیاہی پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے اپنے نصیب کی سیاہی بھی ماند تھی ۔ پیٹ بھر کھانا ۔ کام نہ فکر، کھلی ہوا ۔ وہ روپ نکھرا تھا کہ تنا ہوا گوشت آپی آپ تڑ تڑ بول رہا تھا ۔ وہ جیسے بغیر کسی بندش کے خود کو آزمائے جا رہے تھے ۔ ابھی نہیں ۔۔ ابھی نہیں ۔۔ "

چھٹے مہینے عزیز آیا ۔۔ کوئی دیکھتا تو نہ پہچان پاتا کہ یہ وہی چھ ماہ پہلے کا سوکھا مارا سڑیل چوزہ ہے ۔ جواب یوں اصیل مرغ کی طرح سینے

کتا نے اکڑا اکڑا پھرتا ہے۔ وہ اور چھجو دونوں آزاد پرندوں کی طرح چونچ میں چونچ ڈالے اس حوض کی منڈیر پر بیٹھے چہلیں کر رہے تھے، جو نواب صاحب کی خوابگاہ کے نیچے والے باغ میں تھا۔

"تو کتا خوبصورت ہوگیا رے ـــ" چھجو بے حد بے تکلفی سے بولی "ہور تو تو سونے چاندی کے جیسی جھل جھلا رئی ـــ ہاتھ لگانے کو ڈر لگ رئا کی میلی ہوجائیں گی ـ"

وہ انگوٹھا دکھا کر ہنسی ـــ "ہور جیسا میں تیرے کو ہاتھ لگانے ای تو دیوں گی نا ـ" وہ اٹھ کر بھاگنے لگی۔

عزیز نے اسے لپک کر گود میں بھر لیا ـ "اری تیرا مرد ہوں کُتی..."

اور یہ سب نواب صاحب نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ مرد ـ مرد ـ مرد ـــ

جس پھل کے پکنے کا وہ خود انتظار کر رہے تھے، ایسا پک جائے اتنا پک جائے کہ ٹپ سے جھولی میں گر پڑے، وہ کسی اور کی جھولی میں بھی تو گر سکتا ہے! پھر کیا کریں؟

"مروا دیں ؟" مزہ نہیں

"زہر کھلوا دیں ؟" یہ کوئی کارنامہ نہ ہوا۔

"کہیں پھنکوا دیں ؟" کوئی نئی بات نہیں

پھر ـــ ؟ مرد ـ مرد ـــ اس مرد کو آخر کیا کریں۔

ایک خوفناک منصوبہ ان کے ذہن میں ابھرا ـــ تالی بجا کر خدمتگار کو بلایا ـ خدمت گار مختار عام کو بلا لایا ـ مختار عام کو حکم ہوا "جراح کو بلوا بیٹے ـــ"

جرّاح آگیا تو پوچھا ۔" کبھی کسی بکرے کو آپ کسی بکری کے ناقابل کیئے ہیں ؟"

جرّاح تیور دیکھ کر سب کچھ سمجھ گیا ۔ ہاتھ جوڑ کر بولا ۔" حضور ساری عمر اسی میں گزاری ہے ۔"

مگر اتنا یاد رکھو کی جان نہ جانے پائے ۔"

بہت بہتر حضور ۔"

مختار عام کو کھڑکی کے پاس بلوا کر عزیز کا چہرہ دکھایا اور تاکید کی "سب کام اس پہرے میں ہو۔ رازداری کرنا ۔" جرّاح اُلٹے پیر سر جھکائے جھکائے واپس ہو گیا ۔

تین ہفتے بعد نواب صاحب بہ نفسِ نفیس نوکر خانے میں تشریف لے گئے ، عزیز کے "غسلِ صحت" کا حکم صادر فرمایا ، بڑی مغلانی کو بلوا کر ہدایت کی کہ ایک کمرہ چنبیلی ، موگرہ ، موتیا ، گلاب اور خوشبوؤں سے بسا دیا جائے کچے اگر اور لوبان کے پیالے بھر بھر جلائے جائیں ۔ شہزادی کے لئے سرخ رنگ کا کام دار جوڑا تیار کرایا جائے ۔ اور اسے دلہنوں کا سا روپ سنگھار دینے کے بعد عزیز کو ایک دولہا کی طرح اس کے کمرے میں پہنچا دیا جائے ۔

ہر کام حسبِ حکمِ عالی انجام دیا گیا ۔ لیکن دوسری صبح کمرے کا دروازہ جب باہر والوں نے پیٹ پیٹ کر توڑ کر کھولا تو عزیز سُرخ کام دار دوپٹے کو گلے میں باندھے چھت سے لٹکا ہوا تھا ۔ اور دلہن بنی شہزادی بیہوش پڑی ہوئی تھی ۔

ابھی نہیں ۔۔ ابھی نہیں ۔۔ دراصل وقت ابھی تک بھی نہیں آیا تھا۔ ہر کام مذہب اور شریعت کی رو سے ہونا چاہیئے۔ اس لئے عِدّت کی مدّت ختم ہونے کا مزید انتظار کیا جائے۔ ایک نہ دو پورے تین ماہ دس دن ۔۔ یعنی لگ بھگ کوئی چار مہینے ۔۔ آخر خدا کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔

چوتھے مہینے کے ختم ہونے پر۔

ساری ڈیوڑھی میں نئے سرے سے قلعی کرائی گئی ۔۔ ملازموں کو نئی پوشاکیں بنیں ۔ خواصوں، ماماؤں کنیزوں کو ایک ایک نئے جوڑے کے ساتھ ایک ایک تولہ سونے کا زیور انعام میں دیا گیا۔ پوری ڈیوڑھی میں چراغاں کیا گیا ۔ قالین، پردے فرنیچر بدلے گئے۔ نواب صاحب کا کمرہ جگ مگ کرنے لگا ۔ دروازوں پر سانچے موتیوں کی لڑیوں کے پردے لٹکائے گئے ۔ چھتوں پر جگہ جگہ کم خواب کی چھت گیریاں ٹانکی گئیں ۔۔ ایسے قالین فرش پر بچھائے گئے کہ پاؤں گھٹنوں تک دھنس جائیں ۔ مالیوں اور پھلاریوں کو حکم ہوا کہ ایسے سہرے اور بدھیاں گوندھیں کہ سارا حیدرآباد خوشبو سے مہک اٹھے ۔ باورچیوں کو دعوت عام کے لئے مونہہ مانگی جنس دی گئی ۔ ہزاروں سیر اصلی گھی، بریانی، متنجن، پلاؤ، میٹھوں میں انڈیلا، جانے لگا ۔ ڈیوڑھی کے کنوؤں میں کئی سو تھیلے شکر ڈالی گئی کہ پانی شربت کی طرح میٹھا ہو جائے اور لوگ پانی کی بجائے شربت پی پی کر دعائیں دیں ۔۔ اور یہ سب اس لئے ہو رہا تھا کہ نواب صاحب ایک باندی کو اپنانے جا رہے تھے ۔ یہ ساری تیاریاں اور ہنگامے اور چونچلے اس لئے تھے کہ نواب

صاحب کو آج تک زندگی میں کوئی شکل اس شدت سے نہیں بھائی تھی

اِدھر ڈیوڑھی کے زنان خانے میں کئی کئی مغلانیاں بیک وقت ایک شہزادی پر جُتی ہوئی تھیں ۔ خالص شمامۃ العنبر، حنا اور گلاب کے عطر سے اس کے بدن کی مالش ہو رہی تھی ۔ لمبے لمبے بالوں کو مٹی کی سوراخ والی ہنڈیا میں لوبان اور عود سے چٹختے انگاروں کے دھوئیں میں بسایا جا رہا تھا ۔ شہزادی کے لئے جو جوڑا سِلا تھا اس میں سچے یاقوت ٹانکے گئے تھے اور مانگ میں بھرنے کے لئے جو افشاں بنائی گئی وہ تولہ بھر سچے ہیروں کو پیس کر تیّار کی گئی تھی ۔

رات چڑھی تو پیاس بھی بڑھی ۔

پھر کوئی رات کے دس ۔ گیارہ بجے ، نواب صاحب بغیر نکاح بغیر گواہوں ، بغیر وکیل ، بغیر مہر، بغیر کسی پابندی کے دلہن کی خوابگاہ میں داخل ہو گئے کہ اس خداوند تعالیٰ نے ، جس نے یہ دنیا ، یہ مرد و زن بنائے ہیں ، اسی نے صاحب حیثیت مردوں پر باندیاں لونڈیاں بھی حلال کر دی ہیں ۔

اندر صحن میں اصلی گھی سے تر تراتی بریانی کھاتے ہوئے مالن، تمبولن سے بولی :

" اُجاڑ ماری کیا نصیبے والی ہے سچ مچ شہزادی بن گئی ۔ "